شذرات		
اخلاقی جارحیت	منظور الحسن	۲
مطالعۂ سیرت	طالب محسن	۵
قرآنیات		
النساء (۴: ۲۵-۲۸)	جاوید احمد غامدی	۹
معارف نبوی		
ہمسایے سے حسن سلوک	طالب محسن	۱۳
جائز نذریں	محمد رفیع مفتی	۱۸
مرتد کو توبہ کا موقع دینے سے متعلق روایت	معز امجد	۲۱
حاجی کے لیے لگڑ بگڑ کا شکار	ساجد حمید	۲۳
نقطۂ نظر		
نور نبوی کی تخلیق	مولانا حبیب الرحمٰن کاندھلوی	۲۷
نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ وفات	محمد اسحاق ناگی	۳۱
اصلاح معاشرہ	خالد مسعود	۳۴
سیر و سوانح		
کار رسالت کے لیے تربیت	خالد مسعود	۳۹
عمر فاروق رضی اللہ عنہ (۵)	محمد وسیم اختر مفتی	۵۴
یسئلون		
متفرق سوالات	طالب محسن	۶۱

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

منظور الحسن

اخلاقی جارحیت

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

حقوق کے تحفظ کے لیے ہم مسلمانوں کا لائحۂ عمل مسلح جارحیت ہے۔ گزشتہ تین صدیوں سے ہم اسی پر کاربند ہیں۔ قوم کے مذہبی اور سیاسی پیشواؤں نے اسی کو اختیار کرنے کی تلقین کی ہے اور عوام الناس پوری دل جمعی سے اس پر عمل پیرا ہیں۔ اس کی روح یہ ہے کہ اگر ہم منتشر ہوں تو تشدد آمیز کارروائیوں کے ذریعے سے دنیا کو اپنے مسائل کی طرف متوجہ کریں اور اگر کچھ مجتمع ہوں تو جنگ و جدل سے اپنا حق حاصل کرنے کی جدوجہد کریں۔ یہ لائحۂ عمل اختیار کر کے ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا ہے، اس کی تفصیل کشمیر، فلسطین، افغانستان اور عراق کے موجودہ حالات میں دیکھی جا سکتی ہے۔ تین صدیوں کے حوالے سے ہماری یافت و نایافت کی فہرست بندی کی جائے تو معلوم ہو گا کہ جو کچھ ہم نے حاصل کیا ہے، وہ شکست و تنزل اور غربت و جہالت ہے اور جس سے محروم ہوئے ہیں، وہ عظمت و رفعت اور علم و اخلاق ہے۔ مسلح جارحیت کے اس لائحۂ عمل کو ہم نے ہمیشہ جہاد سے تعبیر کیا ہے اور اس طرح اپنے مزعومہ اقدامات کو یہ عنوان دے کر دنیا کو پیغام دیا ہے کہ اسلامی شریعت خدانخواستہ جنگ و جدل کی علم بردار ہے۔

شریعت کی اصطلاح میں جہاد اقوام کے ظلم و جبر کے خلاف اسلامی ریاست کا مسلح اقدام ہے۔ قرآن مجید کی رو سے اس اقدام کے لیے قوت ایمانی کے ساتھ ساتھ مادی قوت کا حصول ناگزیر ہے۔ مگر ہمارا طرز عمل ہمیشہ یہ رہا ہے کہ نہایت کمزور ایمان اور اسلحے کی قوت سے بالکل محروم ہونے کے باوجود نصرت الٰہی کے دعوے کے ساتھ میدان جنگ میں اترتے رہے ہیں۔ یہ سفاہت ہے یا دین سے ناآشنائی، بہرحال اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہم اپنے لاکھوں رجال کار کو جنگ کی بھینٹ چڑھا کر فارغ ہو چکے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ ہے کہ ہم نے علم و دانش، اصلاح و دعوت اور

قومی تعمیر و ترقی کے دروازے بھی بند کر رکھے ہیں۔

چنانچہ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ علم، اخلاق اور رزق کے معاملے میں ہم پر نہایت کس مپرسی کی حالت طاری ہے۔ ہم غربت کے اس مقام پر ہیں کہ ہماری اکثریت بنیادی ضروریات زندگی سے محروم ہے۔ جہالت کی یہ سطح ہے کہ ان علوم سے بھی غافل ہو چکے ہیں جنھیں خود ہم نے وجود بخشا تھا۔ اخلاقی پستی کا یہ عالم ہے کہ بد دیانتی، دھوکا دہی، ملاوٹ اور قانون شکنی میں دنیا بھر میں ہمارا کوئی ثانی نہیں ہے۔ بے وقاری کی یہ حالت ہے کہ بین الاقوامی معاملات میں ہم پر کوئی اعتماد کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اور مظلومیت کا یہ معاملہ ہے کہ صحیح ہوں یا غلط، ہر حال میں مجرم قرار پاتے ہیں اور سزا کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہماری اس حالت زار کی سب سے بڑی وجہ لائحۂ عمل کی غلطی ہے۔ افغانستان اور عراق کے پے در پے سانحوں کے بعد ممکن ہے کہ ہم اس غلطی کا ادراک کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ اگر ایسا ہو جاتا ہے تو پھر ہمیں مسلح جارحیت کا لائحۂ عمل ترک کر کے اخلاقی جارحیت کے نئے لائحۂ عمل کو اختیار کرنا چاہیے۔ یہی وہ واحد راستہ ہے جسے اپنا کر کوئی کمزور اور مظلوم قوم اپنے لیے تعمیر و ترقی کے بند دروازے کھول سکتی ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیے کہ ہم اگرچہ اپنی تعداد کے لحاظ سے دنیا کی چند بڑی اقوام میں شمار ہوتے ہیں، مگر قوت و استعداد کے لحاظ سے اقوام عالم میں ہمارا کوئی مقام نہیں ہے۔ دنیا کے سیاسی، اقتصادی اور سائنسی و تکنیکی منظر پر ہماری کوئی جگہ نہیں ہے اور نہ اس بات کا امکان ہے کہ مستقبل قریب میں کوئی جگہ پیدا ہو جائے۔ اس اعتراف حقیقت کے بعد ہمیں مسلح جدوجہد کے بجائے غیر مسلح طور پر اخلاقی جدوجہد کا آغاز کرنا چاہیے۔ ہم انفرادی اور اجتماعی اعتبار سے اعلیٰ اخلاقی معیار پر کھڑے ہو جائیں۔ قومی اور بین الاقوامی، دونوں معاملات میں اخلاقی موقف اپنائیں اور اس کے لیے اگر مفادات بھی قربان کرنے پڑیں تو اس سے دریغ نہ کریں۔ اگر تشدد کا سامنا کرنا پڑے تو صبر و استقامت کے ساتھ اس کا سامنا کریں۔ اپنے حقوق کی جدوجہد کو سرتاسر مظلومانہ بنائیں اور ظالم کو یہ موقع نہ دیں کہ وہ کسی بہانے ہم پر حملہ آور ہو سکے۔ اس مقصد کے لیے اگر تنازعات کو یک طرفہ طور پر بھی ختم کرنا پڑے تو اس سے بھی گریز نہ کریں۔ دنیا کے ایوانوں میں ہر حال میں مظلوم کا ساتھ دیں۔ عدل و انصاف کا دامن کسی حال میں نہ چھوڑیں خواہ اس کی زد اپنے قومی وجود ہی پر کیوں نہ پڑے۔ ہر طرح کے تعصب کو بالاے طاق رکھتے ہوئے آزادی، جمہوریت، مساوات اور انسانی ہمدردی جیسی اقدار کا بول بالا کریں۔ ہر حال میں جنگ کی مذمت کریں اور امن و سلامتی کی تلقین کریں۔ مذہبی اور سیاسی اختلافات کو برداشت کریں اور دوسروں کو بھی یہی طرز عمل

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اپنانے کی نصیحت کریں۔ان مقاصد کے حصول کے لیے موجودہ زمانے کی اخلاقی بیداری سے بھرپور فائدہ اٹھائیں،ان اداروں کی تعمیر وترقی میں کردارادا کریں جو دنیا میں انسانی حقوق کی آواز بلند کررہے ہیں اور میڈیا کے تمام ذرائع کو پوری طرح بروے کارلائیں۔

اخلاقی جارحیت، درحقیقت صبر و برداشت اور حکمت و دانش سے عبارت ہے۔ جب کوئی قوم کسی ظالم قوم کے مقابلے میں مجبور و بے بس ہو، جب اس کے پاس دفاع کی معمولی طاقت بھی موجود نہ ہو، جب اقوام عالم میں سے کوئی اس کی مدد کی ہمت نہ کر سکے اور جب دنیا میں کوئی ایسی عدالت بھی قائم نہ ہو جو اس پر ہونے والے ظلم کو قانون کی قوت سے روک سکے تو اس موقع پر واحد لائحۂ عمل اخلاقی جارحیت ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ جور وستم کا مقابلہ اخلاق و کردار کی قوت سے کیا جائے۔قومی وجود میں امن، آزادی، استدلال، عدل، صلہ رحمی اور حق پرستی جیسی انسانیت کی مشترک اقدار کو مستحکم کیا جائے اور ان کی بنا پر انسان کے اجتماعی ضمیر کو آواز دی جائے۔کوئی قوم اگر صبر و استقامت سے یہ آواز بلند کرتی رہے تو انسانیت کا اجتماعی ضمیر لازماً اس پر لبیک کہہ اٹھتا ہے۔ بصورت دیگر عالم کا پروردگار اپنی آواز اس آواز میں شامل کر دیتا ہے۔مظلوم کی دادرسی آسمان سے ہوتی ہے اور ظلم و جبر کی بساط بالآخر لپیٹ دی جاتی ہے۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

طالب محسن

مطالعۂ سیرت

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالعہ، بالعموم، دو جہتوں سے کیا جاتا ہے۔ ایک جہت مطالعہ میں، قاری، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کام اور کارناموں کا مطالعہ کرتا ہے، اور ان کی عظمت کے اعتراف اور خراج تحسین کے کلمات زبان پر لاتا ہے۔ اس جہت کو پسند کرنے والے لوگوں کو آپ کی مدینہ کی زندگی، جنگی کارنامے، طرز حکومت اور اس طرح کے دوسرے معاملات زیادہ قابل توجہ معلوم ہوتے ہیں اور اس میں وہ لوگ ہی زیادہ دل چسپی لیتے ہیں، جو انقلاب اسلامی کے لیے کوشاں ہیں اور اس کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے مثالیں اور لائحۂ عمل برآمد کرنا چاہتے ہیں۔

دوسری جہت مطالعہ میں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات کے غیر معمولی پہلو میں زیادہ دل چسپی لی جاتی ہے۔ واقعۂ معراج، اسرار نبوت اور دوسرے خلاف عموم واقعات، جیسے معجزات کا صدور، اس طرح کے لوگوں کی دل چسپی کا موضوع قرار پاتے ہیں۔ اور وہ معجزانہ واقعات کے مطالعے میں اس طرح دل چسپی لیتے ہیں کہ بدرجۂ آخر خود بھی ایسی ہی غیر معمولی صلاحیت حاصل کر لینے کے خواہاں ہو جاتے ہیں یا اس بات کو شخصی برتری کی علامت جاننے لگتے ہیں۔

قرآن مجید نے ان دونوں پہلووں کے برعکس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے تیسرے پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے، جس کا مطالعہ، سیرت میں، اصلاً پیش نظر ہونا چاہیے۔ اور وہ پہلو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی کردار کا پہلو ہے۔

پہلی جہت، جس میں آپ کی زندگی کے مشن کے مراحل بیان ہوتے ہیں، اس کا بہت سا حصہ صرف منصب رسالت کے ساتھ خاص ہے، اور دوسری جہت، کلیتہً، انبیا و رسل کے ساتھ ہی مخصوص ہے۔ جس طرح پہلی جہت کے حوالے

سے جو حقوق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھے، ہمیں حاصل نہیں ہو سکتے ، اور نہ وہ خصوصیات ہی ہمارے اندر پیدا ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح دوسری جہت میں انبیا و رسل کی خصوصیات بھی کسی آدمی کا نصیب نہیں ہیں۔ لیکن یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ امت مسلمہ کی عظیم اکثریت انھی پہلوؤں کو اپنا مطمح نظر بنائے ہوئے ہے۔ جبکہ آپ کی سیرت کا وہ پہلو، جسے قرآن مجید اسوۂ حسنہ قرار دیتا ہے اور جسے اپنانے اور اختیار کرنے اور جس کی اتباع کی قرآن مجید تلقین کرتا ہے، مسلمانوں کی توجہ اس کی طرف کم ہی جاتی ہے۔

منصب رسالت کے مطالعے سے ہمیں اللہ کے رسولوں کے باب میں قانون الٰہی کا علم حاصل ہوتا ہے۔ ان کی نبوت کے فیضان سے ہمیں خدا کی مرضیات کا علم حاصل ہوتا ہے، اور ان کی سیرت ہمارے لیے جادۂ حیات کے مراحل میں مشعل راہ بنتی ہے۔

رسولوں اور نبیوں کی یہ خصوصیت کہ انھیں خدا اور فرشتوں کے ساتھ خصوصی تعلق ہوتا ہے، ختم نبوت کے بعد اس کے امکانات بھی ختم ہو گئے ہیں۔ پھر قرآن و حدیث اس تصور سے خالی ہیں کہ کسی شخص کی نیکی ، اس کا خدا کی طرف لگاؤ، عبادت اور ذکر و تسبیح میں غیر معمولی اشتغال کسی شخص کو اس قابل بنا دیتے ہیں کہ اسے خدا کی طرف سے الہام ہو، فرشتوں سے اس کی ملاقات ہونے لگے یا اس کے وجود سے غیر معمولی واقعات ظاہر ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ انبیا و رسل کے انتخاب کی بنیاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن مجید اس بات کی قطعی نفی کرتا ہے کہ یہ منصب کسی فرد کی کسی کاوش یا محنت کا نتیجہ ہوتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت دی، مدینے میں سرداران شہر نے دعوت قبول کر لی اور صرف مسلمان ہی نہیں ہوئے، بلکہ مدینے کو پہلی اسلامی ریاست بنا دینے پر تیار ہو گئے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا پہلا حکمران تسلیم کر لیا۔ پھر اس ریاست میں جو انقلاب برپا ہوا تھا، اسے پورے عرب تک پھیلانے کے لیے، اس ریاست کے شہریوں نے ، اپنے جان و مال سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا۔ اللہ کی خصوصی نصرت شامل حال رہی اور پورا جزیرہ نمائے عرب اس چھوٹی سی اسلامی ریاست کے زیرنگوں آ گیا، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حال میں دنیا سے رخصت ہوئے کہ اسلامی افواج عرب کی سرحدوں سے آگے نکلنے کے لیے تیار تھیں۔ یہ، درحقیقت ، ایک الٰہی منصوبہ تھا۔ اس کا تعلق کسی تدبیر سے نہیں تھا۔

رسول اللہ صادق اور امین تھے۔ رسول اللہ حد درجہ سخی تھے۔ رسول اللہ دین کے لیے غیر معمولی حمیت رکھتے تھے۔ رسول اللہ دوسروں کی مدد کرنے والے اور ان کے لیے ایثار کرنے میں سب سے آگے تھے۔ دین پر استقامت اور حق

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

کے لیے ثابت قدمی میں آپ نے کبھی بال برابر بھی انحراف نہیں کیا۔اپنے مدعوئین کے ساتھ نرم روی، خیر خواہی اور دل کی کشادگی میں کوئی آپ کا ہم سر نہ تھا۔عفوودرگزر اور عیب پوشی آپ کے کردار کا ایک مستقل حصہ تھی۔ بیویوں سے معاملہ کیا تو دل داری اور انصاف کے سارے تقاضے پورے کر دیے۔حکمران بنے تو انصاف، برابری اور حسن معاملہ کی اقدار پر حرف نہ آنے دیا۔میدان جنگ میں اترے تو استقامت، بہادری اور صبر کے لحاظ سے بے مثال نظیریں قائم کر دیں۔ باپ کی حیثیت سے دیکھیے تو شفقت، سر پرستی اور تربیت جیسی تمام ذمہ داریاں بتمام وکمال پوری کر دیں۔ اللہ کی عبادت کرتے تو خشوع وانابت، توجہ الی اللہ آپ کا سراپا ہو جاتیں۔ دین پر عمل کرنے میں ہمیشہ سبقت کے مقام پر رہے اور کوئی موقع ایسا نہیں آیا کہ آپ دوسرے درجے پر رہے ہوں۔ یہی، دراصل، اسوۂ رسول ہے اور یہی وہ پہلو ہے جسے قرآن مجید واجب الاتباع قرار دیتا ہے۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ النساء

(۹)

(گزشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ، فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ، مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ، وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ، بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ، فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ، وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ،

اور تم میں سے جو آزاد مسلمان عورتوں کے ساتھ نکاح کی مقدرت نہ رکھتے ہوں، اُنھیں چاہیے کہ تمھاری اُن مسلمان لونڈیوں سے نکاح کر لیں جو تمھارے قبضے میں ہوں[۶۱]، اور (یہ حقیقت پیش نظر رکھیں کہ) اللہ تمھارے ایمان سے خوب واقف ہے[۶۲]۔ تم سب ایک ہی جنس سے ہو[۶۳]۔ سو اُن کے مالکوں کی

[۶۱] یہ بھی انھی اقدامات میں سے ہے جو غلامی کے ادارے کو بتدریج ختم کر دینے کے لیے کیے گئے۔ چنانچہ اجازت دی گئی کہ جن لونڈیوں کی تربیت ان کے مالکوں نے اچھے طریقے سے کی ہے، انھیں پاک دامن رکھا ہے اور وہ مسلمان بھی ہو گئی ہیں، ان کے ساتھ وہ لوگ نکاح کر لیں جنھیں خاندانی عورتوں کے ساتھ نکاح کا مقدور نہیں ہے تاکہ ان کی ضرورت بھی پوری ہو جائے اور یہ عورتیں بھی، جنھیں ذہنی اور اخلاقی لحاظ سے پستی میں گرا دیا گیا ہے، خاندانی عورتوں کے برابر ہو کر زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں۔

[۶۲] یعنی عزو شرف کی اصلی بنیاد ایمان پر ہے اور یہ محض خاندانی گھرانوں ہی کا حصہ نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ

مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ، وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ، فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ، ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ، وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ، وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢٥﴾

اجازت سے اُن کے ساتھ نکاح کرلو اور دستور کے مطابق اُن کے مہر بھی اُن کو دو[64]، اِس شرط کے ساتھ کہ وہ پاک دامن رہی ہوں، بدکاری کرنے والی اور چوری چھپے آشنائی کرنے والی نہ ہوں۔ پھر جب وہ پاک دامن رکھی جائیں اور اِس کے بعد اگر کسی بدچلنی کی مرتکب ہوں تو اُن پر اُس سزا کی آدھی سزا ہے جو آزاد عورتوں کے لیے مقرر کی گئی ہے[65]۔ یہ اجازت تم میں سے اُن لوگوں کے لیے ہے جنھیں گناہ میں پڑ جانے کا اندیشہ ہو[66]۔ ورنہ صبر کرو تو یہ تمھارے لیے بہتر ہے اور (مطمئن رہو کہ احتیاط کے باوجود کوئی

ایک لونڈی اپنے ایمان کے لحاظ سے بڑے بڑے شریف زادوں اور شریف زادیوں پر فوقیت رکھتی ہو۔

[۶۳] مطلب یہ ہے کہ تم سب آدم و حوا کی اولاد ہو۔ لونڈی اور غلام ہونا محض ایک عارضی حالت ہے۔ انسان ہونے کے اعتبار سے تم میں کوئی فرق نہیں ہے۔

[۶۴] اس لیے کہ سوسائٹی کے اندر ان کا معیار اونچا ہو اور انھیں بھی عام عورتوں کے برابر سمجھا جائے۔

[۶۵] اس سے یہ حقیقت پوری قطعیت کے ساتھ واضح ہو جاتی ہے کہ سورۂ نور میں زنا کے مجرموں کے لیے سو کوڑے کی جو سزا بیان ہوئی ہے، وہ اس جرم کی انتہائی سزا ہے اور صرف انھی مجرموں کو دی جائے گی جن سے جرم بالکل آخری درجے میں سرزد ہو جائے اور اپنے حالات کے لحاظ سے وہ کسی رعایت کے مستحق نہ ہوں۔ پاگل، بدھو، مجبور، سزا کے تحمل سے معذور اور جرم سے بچنے کے لیے ضروری ماحول، حالات اور حفاظت سے محروم سب لوگ اس سے یقیناً مستثنیٰ ہیں اور عدالت انھیں کوئی کم تر سزا بھی دے سکتی ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ خاندان کی حفاظت سے محرومی اور ناقص اخلاقی تربیت کی وجہ سے لونڈیوں کو سو کوڑے کی یہ سزا نہیں دی جائے گی، یہاں تک کہ اس صورت میں بھی جب ان کے مالکوں اور شوہروں نے انھیں پاک دامن رکھنے کا پورا اہتمام کیا ہو، وہ اس سزا کی نسبت سے آدھی سزا کی مستحق ہوں گی۔ یعنی سو کے بجائے انھیں پچاس کوڑے مارے جائیں گے۔

[۶۶] یہ اس لیے فرمایا ہے کہ اس طرح کے نکاح میں حقوق ملکیت اور حقوق نکاح میں تصادم کا اندیشہ تھا اور یہ

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ، وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ، وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۶﴾

وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ، وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ﴿۲۷﴾

غلطی ہو جاتی ہے تو) اللہ بخشنے والا ہے، اس کی شفقت ابدی ہے۔ ۲۵

اللہ کا ارادہ ہے کہ تم پر اپنی آیتیں واضح کر دے[۶۷] اور تمھیں اُن لوگوں کی راہوں پر چلائے جو تم سے پہلے گزرے ہیں اور تم پر عنایت کی نظر کرے، اور اللہ علیم و حکیم ہے[۶۸]۔ ۲۶

اور اللہ تو یہی چاہتا ہے کہ تم پر عنایت کی نظر کرے، لیکن وہ لوگ جو اپنی خواہشوں کی پیروی کر رہے ہیں، اُن کی خواہش (اِس کے برخلاف) یہ ہے کہ تم حق کے راستے سے بالکل ہی بھٹک کر رہ جاؤ[۶۹]۔ ۲۷

چیز ازدواجی زندگی کو برباد کر دے سکتی تھی۔

[۶۷] اصل میں 'یرید اللّٰہ لیبین لکم' کے الفاظ آئے ہیں۔ ان میں 'یرید' کے بعد 'ل' ہے اور اس کے بعد آیت ۲۷ میں 'ان'۔ یہ فرق کیوں ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...قرآن مجید میں ان دونوں اسلوبوں کے تتبع سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ 'اراد' کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک تو قطعی فیصلے اور حتمی ارادہ کے معنی میں، دوسرے چاہنے کے معنی میں۔ جب پہلے معنی مراد ہوتے ہیں تو اس کے بعد 'ل' آتا ہے اور جب مجرد چاہنے کے معنی میں آتا ہے تو اس کے بعد 'ان' آتا ہے۔''

(تدبر قرآن ۲/ ۲۸۲)

ہم نے ترجمہ انھی اسالیب کی رعایت سے کیا ہے۔

[۶۸] یہ پوری بات ایک فیصلۂ الٰہی کی حیثیت سے بیان ہوئی ہے۔ اس کی وجہ ہمارے نزدیک، یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے تمام عالم کے لیے اتمام ہدایت کا اہتمام اللہ تعالیٰ کی اسکیم میں پہلے سے طے تھا، انبیا علیہم السلام نے اس کی خبر دی تھی اور یہ خدا کے علم و حکمت کا تقاضا بھی تھا، اس لیے کہ وہ علیم و حکیم لوگوں کو پیدا کر کے ان کی ہدایت کے اہتمام سے غافل نہیں ہو سکتا تھا۔

یُرِیۡدُ اللّٰہُ اَنۡ یُّخَفِّفَ عَنۡکُمۡ، وَ خُلِقَ الۡاِنۡسَانُ ضَعِیۡفًا﴿۲۸﴾

اللہ تم پر سے پابندیوں[۷۰] کو ہلکا کرنا چاہتا ہے، (اِس لیے کہ تمھاری کمزوریوں کی رعایت کرے) اور (حقیقت یہ ہے کہ) انسان بڑا ہی کمزور پیدا کیا گیا ہے[۷۱]۔ ۲۸

[۶۹] اشارہ ہے اہل کتاب، بالخصوص یہود کی طرف جو دین حق اور اس کے پیرووں کے ساتھ اپنے عناد کی وجہ سے دن رات اسی تگ و دو میں لگے رہتے تھے۔

[۷۰] یہ ان پابندیوں کی طرف اشارہ ہے جو علما کی فقہی موشگافیوں کے باعث لوگوں پر لگ چکی تھیں۔ قرآن نے دوسری جگہ انھیں اصرواغلال سے تعبیر فرمایا ہے۔

[۷۱] یہ انسان کی فطرت کا بیان ہے۔ مدعا یہ ہے کہ جو غیر فطری اور خودساختہ بوجھ اس پر ڈال دیے گئے تھے، انھیں ایک دن اترنا ہی تھا۔ انسان کا خالق اس کی کمزوریوں سے واقف ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ ایسے بوجھوں تلے اس کو دبا رہنے دے جن کا تحمل اس کے لیے ممکن نہ ہو یا سخت دشوار ہو جائے۔

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

طالب محسن

ہمسایے سے حسن سلوک

(مسلم، رقم ۴۶)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

عَنْ أَبِی هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ لَا یَأْمَنُ جَارُهُ بَوَائِقَهُ.

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوسکتا جس کے ہمسایے اس کی اذیت رسانی سے محفوظ نہ ہوں۔''

لغوی مباحث

لا یدخل الجنة: وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ شارحین میں اختلاف ہے کہ یہاں مطلق نفی مراد ہے یا مشروط نفی۔ مطلق نفی کی صورت میں وہ اس جملے کو منافقین یا خدا کے حلال کو حرام قرار دینے کے مرتکب (یعنی جس سے کفر کا ارتکاب ہوا ہے) سے متعلق مانتے ہیں۔ مشروط نفی سے ان کی مراد یہ ہے کہ یہ پہلے مرحلے میں جنت میں جانے والوں میں سے نہیں ہوگا، بلکہ کچھ سزا پا کر اللہ کی مغفرت اور شفاعت کے نتیجے میں جنت میں جائے گا۔ ہمارے نزدیک اس جملے سے واضح ہے کہ ہمسایے کو تکلیف دینے والا جنت میں اس وقت تک نہیں جا سکے گا جب تک وہ اپنے

اس کیے کی تلافی نہ کر لے، خواہ یہ تلافی دنیا میں کی گئی ہو اور خواہ یہ تلافی اپنی کچھ نیکیاں دے کر یا سزا بھگت کر کی گئی ہو۔

بوائق: 'بائقة' کی جمع ہے اور اس کے معنی وہ امور ہیں جو انسان کے لیے مصیبت اور ہلاکت کا باعث ہوں۔ یہاں جس حوالے سے یہ لفظ استعمال ہوا ہے، اس میں اس سے مراد ہاتھ، زبان اور عمل سے اذیت رسانی ہے۔

معنی

لغوی مباحث کے تحت ہم نے یہ بات بیان کر دی ہے کہ ہمارے نزدیک 'لا یدخل الجنة' کے الفاظ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات واضح کی ہے کہ ہمسایے کو تکلیف پہنچانے والا اس وقت تک جنت میں نہیں جا سکتا جب تک اس نے اپنی اس غلطی کی تلافی نہ کر دی ہو۔ یہ تلافی اگر دنیا ہی میں کر دی گئی ہے تو درست ورنہ آخرت میں اس کی کچھ نیکیاں مظلوم کو دے کر یا کچھ وقت جہنم کی سزا دے کر کی جائے گی۔ اس روایت کی وضاحت کرتے ہوئے استاد محترم جناب جاوید احمد صاحب غامدی نے یہ نکتہ بھی واضح کیا تھا کہ انسان کی آزمایش درحقیقت اس کے اخلاقی وجود کی آزمایش ہے۔ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کی ادائیگی بعض اوقات آدمی کو اس بات سے بے پروا کر دیتی ہے کہ اس کا برتاؤ لوگوں کے ساتھ کیسا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے واضح ہوتا ہے کہ لوگوں کے لیے ضرر اور اذیت کا معاملہ ایک سنگین معاملہ ہے۔ اس کے بارے میں باخبر رہنا چاہیے۔ اس کا نتیجہ جہنم کی صورت میں نکل سکتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

قرآن مجید نے تعلق کے ہر دائرے میں حسن سلوک کا حکم دیا ہے۔ سورۂ نساء میں ہے:

وَاعۡبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشۡرِكُوۡا بِهٖ شَيۡئًا وَّبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا وَّبِذِى الۡقُرۡبٰى وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنِ وَالۡجَارِ ذِى الۡقُرۡبٰى وَالۡجَارِ الۡجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالۡجَنۡبِ وَابۡنِ السَّبِيۡلِ وَمَا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ، اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنۡ كَانَ مُخۡتَالًا فَخُوۡرًا (۴:۳۶)	''اور اللہ ہی کی بندگی کرو اور کسی چیز کو بھی اس کا شریک نہ ٹھہراؤ اور والدین، قرابت مند، یتیم، مسکین، قرابت دار پڑوسی، بیگانہ پڑوسی، ہم نشین، مسافر اور اپنے مملوک کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ بے شک، اللہ اترانے والوں اور بڑائی مارنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

اس آیت میں والدین، قرابت مندوں اور ہر طرح کے تعلق میں حسن سلوک کی ہدایت کی گئی ہے۔ اور یہ بھی بتا

دیا ہے کہ ان رشتوں میں بدسلوکی کا محرک اپنی بڑائی کا احساس ہے۔ یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ اپنی بڑائی میں مبتلا لوگ اللہ کو پسند نہیں ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بات کو ایک دوسرے اسلوب میں بیان کر دیا ہے۔

اس روایت کا ایک اہم لفظ 'جار' ہے۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا گھر آپ کے گھر کے قریب ہو۔ قرآن مجید میں اس لفظ کے اطلاق کو وسیع کر دیا ہے۔ ایک تو قرآن مجید نے قرابت مند پڑوسی اور اجنبی پڑوسی کا ذکر کر کے یہ واضح کر دیا کہ حسن سلوک کا تقاضا صرف قرابت کے حوالے سے نہیں ہے۔ وہ آدمی جو آپ کے ساتھ قرب مکان ہی کے حوالے سے متعلق ہو گیا ہے، اس سے بھی حسن سلوک ہی مطلوب ہے۔ بات یہاں تک محدود نہیں رکھی، ہم نشیں کا حوالہ دے کر یہ حقیقت نمایاں کر دی کہ ہر وہ شخص جو آپ کے ساتھ متعلق ہے، خواہ یہ تعلق عارضی نوعیت ہی کا کیوں نہ ہو، مسلمان کا کام یہی ہے کہ وہ اس کے ساتھ اچھے برتاؤ کا معاملہ کرے۔

شارحین کے سامنے یہ سوال ہے کہ کبیرہ کے مرتکب کو جہنم کی سزا جمہور اہل علم کا نقطۂ نظر نہیں ہے۔ بظاہر اس روایت سے جمہور کے نقطۂ نظر کی تغلیط ہوتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد محولہ بالا آیت کی روشنی میں پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ جہنم اللہ تعالیٰ کی ناپسندیدگی کا مظہر ہے۔ جو آدمی ایسے عمل کرے جو اسے اللہ کی نظر میں ناپسندیدہ بنا دیں، اسے جہنم ہی کی وعید دی جائے گی۔ باقی رہی یہ بات کہ کیا یہ وہ جرم ہے جس کی معافی نہیں ہے تو اس کا جواب بھی ہمیں قرآن مجید سے مل جاتا ہے کہ شرک کے علاوہ ہر جرم میں معافی کا امکان ہے۔

یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہمسایہ برا ہو تو کیا کرنا چاہیے۔ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف اتنا اقدام تو قابل قبول ہے کہ اس سے آپ زیادتی کا بدلہ لے لیں۔ لیکن یہ بہرحال کم تر درجہ ہے۔ مطلوب اور محمود یہی ہے کہ برائی کے باوجود اہل تعلق سے اچھا سلوک کیا جائے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

متون

روایات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی مواقع پر فرمائی تھی۔ یہاں ہم ان میں سے تین روایات نقل کر رہے ہیں۔ بخاری میں یہ روایت سوال و جواب کے اسلوب میں نقل ہوئی ہے:

عن أبی شریح أن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم قال: واللّٰه لا یؤمن، واللّٰه لا یؤمن، واللّٰه لا یؤمن. قیل: ومن؟ یا	''حضرت ابوشریح رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بخدا، وہ مومن نہیں، بخدا، وہ مومن نہیں، بخدا، وہ مومن نہیں۔

رسول اللّٰه. قال: الذی لا یأمن جاره بوائقه. (رقم ۵۶۷۰)

پوچھا گیا: کون یا رسول اللہ؟ آپ نے فرمایا: وہ جس کے ہمسایے اس کے مہلکات سے محفوظ نہ ہوں۔‘‘

اس روایت میں ایمان کی نفی کی گئی ہے اور مسلم کی روایت میں جنت سے محرومی بیان ہوئی ہے۔ نتیجے کے اعتبار سے دونوں باتیں برابر ہیں۔ ابن حبان کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بات کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ اور باتیں بھی فرمائی تھیں:

عن أنس بن مالك أن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قال: المؤمن من أمنه الناس. المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده. المهاجر من هاجر السوء. والذی نفسی بیده، لایدخل الجنة عبد لا یأمن جاره بوائقه. (رقم ۵۱۰)

’’حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مومن وہ ہے جس سے لوگ محفوظ ہوں۔ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں۔ مہاجر وہ ہے جس نے برائی چھوڑ دی۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، وہ جنت میں نہیں جائے گا جس کے مہلکات سے اس کا پڑوسی محفوظ نہ ہو۔‘‘

مستدرک کی روایت ہے:

عن عبد اللّٰه بن مسعود رضی اللّٰه عنه قال: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: إن اللّٰه قسم بینکم أخلاقکم کما قسم بینکم ارزاقکم. وإن اللّٰه یعطی المال من یحب ومن لایحب. ولا یعطی الإیمان الا من یحب. فمن أعطاه اللّٰه الإیمان فقد أحبه. والذی نفس محمد بیده، لا یسلم عبد حتی یسلم قلبه. ولا یسلم عبد حتی یأمن جاره بوائقه. (رقم ۷۳۰۱)

’’حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تمھارے درمیان اخلاق بھی اسی طرح تقسیم کیے ہیں جیسے رزق تقسیم کیا ہے۔ (فرق یہ ہے کہ) رزق اللہ اسے بھی دیتا ہے جسے پسند کرے اور جسے پسند نہ کرے۔ لیکن ایمان صرف اسے عطا کرتا ہے جسے پسند کرتا ہے۔ چنانچہ جسے اللہ ایمان عطا کرتا ہے اس سے محبت کرتا ہے۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے۔ کوئی بندہ مسلمان نہیں ہوسکتا جب تک اس کا دل مسلمان نہ ہو۔ اور کوئی بندہ مسلمان نہیں ہوسکتا جب تک اس کا ہمسایہ اس کے شر سے

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

محفوظ نہ ہو۔‘‘

ترمذی کی روایت ہے:

عن أبی سعید الخدری رضی اللّٰہ عنه قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: من أکل طیبا، وعمل فی سنة، وأمن الناس بوائقه دخل الجنة.

(رقم ۲۵۲۰)

’’حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے پاکیزہ کھایا، اور سنت کے مطابق عمل کیا اور لوگ اس کے شر سے محفوظ ہوئے، وہ جنت میں داخل ہو گیا۔‘‘

مختلف کتب روایت میں بنیادی طور پر یہی متن ہیں جن میں یہ مضمون بیان ہوا ہے۔ اس کے علاوہ باقی فرق لفظی ہیں۔ ان متون کو نقل کر دینے کے بعد ان کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

کتابیات

بخاری، رقم ۵۶۷۰۔ مسلم، رقم ۴۶۔ ترمذی، رقم ۲۵۲۰۔ احمد، رقم ۳۶۷۲، ۸۶۵۷، ۸۴۱۳، ۸۸۴۲، ۱۲۵۸۳، ۱۳۰۷۱، ۱۶۴۱۹، ۲۷۲۰۶۔ ابن حبان، رقم ۵۱۰۔ حاکم، رقم ۲۱، ۲۵، ۲۹۹۷، ۳۰۰۷، ۳۰۱۷۔ عبدالرزاق، رقم ۱۹۷۴۷۔ ابویعلیٰ، رقم ۳۹۰۹، ۴۱۸۷، ۴۲۵۲، ۶۲۱۸، ۶۴۹۰۔ مسند الشامیین، رقم ۲۴۳۰۔ ابن ابی شیبہ، رقم ۲۵۴۲۲۔ معجم کبیر، رقم ۱۴۳۳، ۴۸۷۷، ۱۰۲۴، ۸۲۵۰، ۱۰۴۴۲، ۱۰۵۵۳۔

محمد رفیع مفتی

جائز نذریں

روي أن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قال: من نذر أن یطیع اللّٰه فلیطعه ومن نذر أن یعصي اللّٰه فلا یعصه[2].

''روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو اللہ کی اطاعت (کے کسی کام) کی نذر مانے اسے چاہیے کہ وہ اسے پورا کرے اور جو اللہ کی نافرمانی (کے کسی کام) کی نذر مانے، اسے چاہیے کہ وہ اسے پورا نہ کرے[1]۔''

ترجمے کے حواشی

۱۔ نذر درحقیقت خدا کا شکر ادا کرنے کی ایک صورت ہے۔ اس میں انسان خدا کی طرف سے کسی کام کے پورا ہونے کی شرط کے ساتھ اپنے اوپر کوئی عمل لازم کر لیتا ہے۔

خدا کا یہ شکر اس کی کسی فرماں برداری ہی کی صورت میں ادا ہو سکتا ہے، نافرمانی کرتے ہوئے ادائے شکر کا کوئی سوال ہی نہیں۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دیا ہے کہ صرف وہ نذریں پوری کرو جن میں تم نے فرماں برداری کے کسی کام کو اپنے اوپر لازم کیا ہو، نافرمانی کے کاموں والی نذریں ہرگز پوری نہ کرو۔

متن کے حواشی

۱۔ یہ موطا امام مالک کی روایت، رقم ۱۰۱۴ ہے۔ انھی الفاظ کے ساتھ یہ روایت حسب ذیل کتب میں بھی موجود ہے۔

سنن أبی داؤد، رقم ۳۲۸۹۔ سنن ترمذی، رقم ۱۵۲۶۔ سنن نسائی، رقم ۳۸۰۶، ۳۸۰۷، ۳۸۰۸۔ سنن ابن ماجہ، رقم ۲۱۲۶۔ سنن دارمی، رقم ۲۳۳۸۔ صحیح ابن حبان، رقم ۴۳۸۷، ۴۳۸۸، ۴۳۸۹۔ سنن البیہقی، رقم ۱۸۶۳۲، ۱۹۸۴۳۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۱۲۱۴۶۔ صحیح ابن خزیمہ، رقم ۲۲۴۱۔

بعض اختلافات کے ساتھ یہی روایت حسب ذیل کتب میں موجود ہے۔

صحیح بخاری، رقم ۶۳۱۸، ۶۳۲۲۔ احمد بن حنبل، رقم ۲۴۱۲۱، ۲۴۱۸۷، ۲۵۹۱۹۔ سنن البیہقی، رقم ۱۹۸۷۶۔

اور اسی روایت کا دوسرا آدھا حصہ (من نذر ان یعصی اللّٰہ فلا یعصہ) درج ذیل کتب میں موجود ہے۔

احمد بن حنبل، رقم ۲۵۷۷۹۔ صحیح ابن حبان، رقم ۴۳۹۰۔ مسند ابی یعلیٰ، رقم ۴۸۶۳۔

۲۔ بعض روایات مثلاً صحیح بخاری، رقم ۶۳۱۸، ۶۳۲۲ اور سنن البیہقی، رقم ۱۹۸۷۶ میں 'یعصی اللّٰہ' (اللہ کی نافرمانی کرے) کے بجائے 'یعصہ' (اس کی نافرمانی کرے) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

اسی طرح بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۲۴۱۲۱ میں لفظ 'اللّٰہ' کے بجائے 'اللّٰہ جل و عز' کے الفاظ اور احمد بن حنبل، رقم ۲۴۱۸۷، ۲۵۹۱۹ میں لفظ 'اللّٰہ' کے بجائے 'اللّٰہ عز و جل' کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

مندرجہ بالا روایت کا مضمون سنن البیہقی، رقم ۱۹۸۵۸ میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

قال النبی صلی اللّٰہ علیہ و سلم: النذر نذران فما کان من نذر فی طاعۃ اللّٰہ فذلک لک وفیہ الوفاء وما کان من نذر فی معصیۃ اللّٰہ فذلک للشیطان ولا وفاء فیہ فیکفرہ ما یکفر الیمین.

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نذر دو طرح کی ہوتی ہے، وہ نذر جو اللہ کی اطاعت (کے کسی کام) کی ہو، تو وہ تمھارے لیے صحیح ہے، اسے لازماً پورا کیا جائے اور جو نذر اللہ کی معصیت (کے کسی کام) کی ہو، تو وہ شیطانی چیز ہے اور اسے ہرگز پورا نہ کیا جائے، (بلکہ اسے توڑ کر اس کا کفارہ دیا جائے) اور اس کا کفارہ وہی ہوگا جو قسم کا کفارہ ہے۔''

اور یہی مضمون سنن البیہقی، رقم ۱۹۸۶۵ میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

www.javedahmadghamidi.com

قال النبي صلى الله عليه و سلم: ان النذر نذران فما كان لله فكفارته الوفاء به و ما كان للشيطان فلا وفاء له وعليه كفارة يمين.

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نذر دو ہی طرح کی ہے، (ایک وہ جو اللہ کو راضی کرنے والی ہو اور دوسری وہ جو شیطان کو راضی کرنے والی ہو) چنانچہ جو نذر اللہ کے لیے ہو، اس کا کفارہ یہ ہے کہ اسے بجا لایا جائے اور جو نذر شیطان کے لیے ہو، اسے ہرگز پورا نہ کیا جائے، (بلکہ اسے توڑ کر اس کا کفارہ ادا کیا جائے، چنانچہ) ایسی نذر ماننے والے کو کفارۂ قسم ادا کرنا ہوگا۔''

ان احادیث میں دو باتیں بتائی گئی ہیں۔ایک یہ کہ باطل نذر ماننے والے کو نذر توڑنا ہوگی اور دوسری یہ کہ اسے اپنی نذر کو توڑنے پر کفارۂ قسم ادا کرنا ہوگا۔

اسی روایت کا ایک حصہ سنن ابن ماجہ، رقم ۲۱۱۰ میں 'من حلف في قطيعة رحم أو فيما لا يصلح فبره أن لا يتم على ذلك' (جس نے قطع رحمی کی قسم کھائی یا کسی ایسے کام کی قسم کھائی جو جائز نہیں تو اس کا پورا کرنا یہی ہے کہ وہ اس پر عمل نہ کرے) کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔اس میں باطل نذر کے کفارے کی نفی کی گئی ہے اور ایسی نذر ماننے والے کے لیے نذر کے پورا نہ کرنے ہی کو کافی قرار دیا گیا ہے۔لیکن اس حدیث سے ہم کوئی استدلال نہیں کر سکتے، کیونکہ اس کی سند میں ایک راوی ضعیف ہے۔چنانچہ وہی بات صحیح ہے جو اوپر بیان ہوئی ہے کہ باطل نذر توڑنا بھی ہوگی اور اس کا کفارہ بھی ادا کرنا ہوگا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

معز امجد

مرتد کو توبہ کا موقع دینے سے متعلق روایت

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

روایت کا مضمون

بیہقی، رقم ۱۶۶۱۰ کے مطابق بیان کیا جاتا ہے کہ

روی أن رسول اللّٰہ استتاب نبهان أربع مرات و كان نبهان ارتد.

''روایت ہے کہ نبہان نے ارتداد اختیار کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے توبہ کرنے کے چار مواقع دیے۔''

یہ روایت ابو یعلیٰ، رقم ۱۷۸۵ اور عبد الرزاق، رقم ۱۸۶۹۹ میں بھی نقل ہوئی ہے۔اس کے علاوہ اس مسئلے کے بارے میں صحابۂ کرام کی آرا بیہقی، رقم ۱۶۶۶۶، ۱۶۶۶۷، ۱۶۶۶۸، ۱۶۶۶۹ میں نقل ہوئی ہیں، جبکہ عبد الرزاق، رقم ۱۸۶۹۷ میں ابراہیم النخعی کی رائے روایت ہوئی ہے۔

روایت پر تبصرہ

مندرجہ بالا روایات میں سے کوئی بھی روایت ایسی نہیں ہے کہ جو قابل اعتماد اور متصل سند سے نقل ہوئی ہو۔

جہاں تک بیہقی، رقم ۱۶۶۱۰ اور عبد الرزاق، رقم ۱۸۶۹۹ کا معاملہ ہے تو ان کی سند میں نہ صرف یہ کہ ایک راوی مجہول ہے، بلکہ یہ سند بھی منقطع ہے، کیونکہ اسے عبد اللہ بن عبید بن عمیر نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، حالانکہ اس کی ملاقات نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے۔

جہاں تک ابویعلیٰ، رقم ۱۷۸۵ کا معاملہ ہے تو اس کی سند میں اسماعیل بن ذکریا الخلقانی شامل ہے جسے العجلی نے ضعیف قرار دیا ہے[۱]۔ ابن معین کے مطابق بھی وہ ایک ضعیف راوی ہے[۲]۔ اس روایت کی سند میں عبداللہ بن محمد بن عقیل بھی ہے جس کے بارے میں اہل علم کی رائے ہے کہ اس کا حافظہ قابل بھروسا نہیں ہے[۳] اور بعض دوسرے اہل علم کے نزدیک وہ روایت کرنے میں غیر محتاط ہے[۴]۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ابن سعد کے نزدیک وہ منکر روایتیں نقل کرتا ہے۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ امام مالک اور یحییٰ بن سعید نے اس سے روایت قبول نہیں کی ہے۔ یعقوب کے مطابق وہ ثقہ آدمی ہے، مگر اس کی روایتیں کمزور ہیں[۵]۔

نتیجۂ بحث

یہ روایت کسی قابل اعتماد سند سے نقل نہیں ہوئی، اس لیے ہم اعتماد کے ساتھ اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہیں کر سکتے۔ یہ ممکن ہے کہ بعض صحابہ مرتد کو سزا دینے سے پہلے اس طرح متعدد بار توبہ کا اختیار دیتے ہوں اور راویوں نے ان کا یہ عمل غلطی سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا ہو[۶]۔

تخریج: محمد اسلم نجمی

کوکب شہزاد

ترجمہ وترتیب: اظہار احمد

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: معرفۃ الثقات۔

۲۔ تہذیب الکمال ۳/ ۹۴۔

۳۔ المجروحین ۲/ ۳۔

۴۔ الکاشف ۱/ ۵۹۴۔

۵۔ تہذیب التہذیب ۶/ ۱۳۔

۶۔ قرآن مجید کے مطابق رسول کے مخاطب مشرک لوگ اگر ایمان نہ لائیں تو انھیں اس دنیا میں باقی نہیں رکھا جاتا۔ اسی طرح اگر وہ ایمان لانے کے بعد مرتد ہو جائیں تو انھیں اسی سزا کا حق دار ہونا چاہیے جو انھیں ایمان نہ لانے کی صورت میں ملتی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے مشرکین مکہ اگر ارتداد اختیار کرتے تو صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ اختیار حاصل تھا کہ انھیں قتل کر دیتے۔ محسوس یہی ہوتا ہے کہ روایت میں اصلاً انھی کے کسی واقعہ کا بیان ہے جو راویوں نے غلطی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا۔

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

ساجد حمید

حاجی کے لیے لگڑ بگڑ کا شکار

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

عن جابر بن عبد اللّٰه قال: سالت رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و سلم عن الضبع.

فقال: هو صید ، ویُجعل فیه کبش اذا صاده المحرم.[1]

''جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہتے ہیں: میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے 'ضبع' کے بارے میں پوچھا۔

آپ نے فرمایا: یہ صید کے حکم میں ہوگا، اور جب محرم اسے شکار کر بیٹھے تو اس کے کفارہ میں ایک مینڈھا دیا جائے گا۔[1]''

ترجمے کے حواشی

۱۔ یہ روایت اپنے تفصیلی واقعے کے ساتھ نقل نہیں ہوئی۔ اس لیے یہ واضح نہیں ہوتا کہ یہ کسی سادہ سوال کا جواب ہے یا یہ سوال کسی کے شکار کر لینے کے بعد آپ سے پوچھا گیا ہے۔ یعنی اگر یہ سادہ سوال ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ 'ضبع' ہر صورت میں صید کے کفارہ کے حکم میں آئے گا اور اگر یہ سوال کسی کے شکار کر لینے کے بعد کیا گیا ہے تو پھر یہ

حکم ہونے والے واقعہ کی صورت حال کے لیے ہوگا، اور اس صورت میں یہ حکم ایک مطلق حکم نہیں رہے گا۔ معلوم یہی ہوتا ہے کہ کسی حاجی نے ضبع کو احرام کی حالت میں اس وقت مار ڈالا تھا، جب وہ کسی اذیت کا باعث نہیں بن رہا تھا، بلکہ اس نے اسے محض درندہ سمجھ کر مار دیا ہوگا۔ ایسے جانوروں کو اسی وقت مارا جا سکتا ہے جب وہ محرم کے لیے نقصان اور اذیت کا باعث بنیں۔

یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ 'الضبع' کے معنی اصلاً لگڑ بگڑ کے ہیں۔ عام طور سے اس کا ترجمہ بجو کیا گیا ہے۔ لیکن میری تحقیق میں یہ بات آئی ہے کہ اس سے اصلاً مراد لگڑ بگڑ ہے۔

متن کے حواشی

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

یہ روایت اصلاً ابوداؤد، رقم ۳۸۰۱ سے لی گئی ہے، اس کے علاوہ یہ درج ذیل مقامات پر آئی ہے: ابن ماجہ، رقم ۳۰۸۵، صحیح ابن حبان، رقم ۳۹۶۴، مسند ابی یعلیٰ، رقم ۲۱۵۹، سنن بیہقی، رقم ۹۶۵۴، ۹۶۵۵، ۹۶۵۶، ۹۶۵۷، ۹۶۵۸، ۱۹۱۷۰، مصنف عبدالرزاق، رقم ۸۲۲۶، الدارمی، رقم ۱۹۴۱، صحیح ابن خزیمہ، رقم ۲۶۴۶، ۲۶۴۸۔

ابن حبان نے اسے رقم ۳۹۶۴ کے تحت یوں روایت کیا ہے: 'سئل رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم عن الضبع فقال: ھی صید و فیھا کبش' (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لگڑ بگڑ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: یہ شکار کے حکم کے تحت ہے اور اس میں کفارہ ایک مینڈھا ہے۔) بیہقی، رقم ۹۶۵۸ کے الفاظ یوں ہیں: 'قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم الضبع صید و جعل فیھا کبشا' (آپ نے کہا: لگڑ بگڑ شکار کے تحت ہے اور آپ نے اس کا کفارہ ایک مینڈھے کو قرار دیا)۔ سنن ابن ماجہ، رقم ۳۰۸۵، صحیح ابن خزیمہ، رقم ۲۶۴۶ میں روایت کے الفاظ یوں ہیں: 'جعل رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم فی الضبع یصیبہ المحرم کبشا و جعلہ من الصید' (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لگڑ بگڑ جسے محرم نے مار ڈالا ہو، کا کفارہ ایک مینڈھا مقرر کیا اور لگڑ بگڑ کے مارنے کو شکار کے حکم کے تحت رکھا)۔

سنن بیہقی، رقم ۹۶۵۵ میں کھانے کی اجازت بھی دی گئی ہے۔ الفاظ یوں ہیں: 'قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم الضبع صید، فکلھا' (آپ نے فرمایا: لگڑ بگڑ شکار ہے تو اسے کھاؤ)۔

سنن بیہقی، رقم ۹۶۵۷ میں یہ یوں بیان ہوئی ہے: 'انزل رسول اللّٰہ ضبعا صیدا و قضی فیھا کبشا' (نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لگڑ بگڑ کو شکار قرار دیا اور اس کے کفارہ میں یہ فیصلہ دیا کہ ایک مینڈھا کفارہ دیا جائے)۔

سنن بیہقی، رقم ۱۹۱۷۰ میں بڑی عمر کے مینڈھے کا ذکر ہے: 'قال الضبع صید و جزاؤھا کبش مسن و تـؤ کل' (آپ نے فرمایا: لگڑ بگڑ شکار ہے، اور اس کا بدل (حالتِ احرام میں مارنے پر) ایک بڑی عمر کا مینڈھا ہے، اور اسے کھایا جا سکتا ہے)۔ مصنف عبد الرزاق، رقم ۸۲۲۶ میں بڑی عمر کے بجائے نجدی مینڈھے کا ذکر ہے: 'و قضا فیھا کبشا نجدیا' (آپ نے لگڑ بگڑ کے کفارہ میں ایک نجدی مینڈھے کا فیصلہ دیا)۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

مولانا حبیب الرحمٰن کاندھلوی

نور نبوی کی تخلیق

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اس موضوع اور ولادت رسول سے متعلق جو روایات عام طور پر کتب سیرت اور میلاد ناموں میں پائی جاتی ہیں، ہم ان پر سید سلیمان ندوی مرحوم کی تحقیق قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں جو انھوں نے سیرت النبی کی جلد سوئم میں فرمائی ہے۔سید صاحب لکھتے ہیں:

''اس سلسلہ میں سب سے پہلی روایت یہ آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوح وقلم،عرش وکرسی،آسمان وزمین اور جن و انس غرض سب سے پہلے نور محمدی کو پیدا کیا۔اور پھر لوح وقلم،عرش وکرسی،آسمان وزمین اور ارواح و ملائکہ سب چیزیں اسی نور سے پیدا ہوئیں۔اس کے متعلق 'اول ما خلق اللّٰہ نوری' (سب سے اول اللہ نے میرے نور کو پیدا کیا) کی روایت عام طور سے زبانوں سے جاری ہے،مگر اس روایت کا احادیث کے دفتر میں مجھے کہیں کوئی پتا نہیں ملا،البتہ ایک روایت مصنف عبدالرزاق بن ہمام میں ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے:

یا جابر اول ما خلق اللّٰہ نور نبیك من نورہ.	''اے جابر،سب سے اول اللہ تعالیٰ نے اپنے نور سے تیرے نبی کے نور کو پیدا کیا۔''

اس کے بعد ذکر ہے کہ اس نور کے چار حصے ہوئے،اور ان ہی سے لوح وقلم،عرش وکرسی،آسمان وزمین اور جن و انس کی پیدایش ہوئی۔

زرقانی وغیرہ نے اس روایت کو نقل کیا ہے، مگر افسوس ہے کہ اس کی سند نہیں لکھی۔ ہندوستان میں مصنف عبدالرزاق کی گو دوسری جلد ملتی ہے، مگر پہلی نہیں ملتی۔ دوسری جلد دیکھ لی گئی ہے، مگر اس میں یہ حدیث مذکور نہیں، اس لیے اس روایت کی تنقید نہیں ہو سکی۔ اور چونکہ کتاب مذکور میں صحیح حدیثوں کے ساتھ ساتھ موضوع حدیثیں تک موجود ہیں۔ اور فضائل ومناقب میں اس کی روایتوں کا اعتبار کم کیا جاتا ہے، اس لیے اصولی حیثیت سے اس روایت کے تسلیم کرنے میں مجھے پس وپیش ہے۔ اس تردد کو قوت اس سے اور بھی زیادہ ہوتی ہے کہ صحیح احادیث میں مخلوقات الٰہی میں سب سے پہلے قلم تقدیر کی پیدایش کا تصریحی بیان ہے کہ: 'اول ما خلق اللّٰہ القلم' (اللہ تعالیٰ نے سب سے اول قلم کو پیدا فرمایا۔) (ترمذی، کتاب القدر)'' (سیرت النبی ۳/۷۳۷)

عبدالرزاق بن ہمام کی مصنف اب دس جلدوں میں شائع ہو چکی ہے، لیکن اس میں صحیح، ضعیف، مرسل، منقطع، منکر اور موضوع سب ہی قسم کی روایات ہیں۔

اس کے علاوہ خود عبدالرزاق کی ذات مشکوک ہے۔ محدثین کا بیش تر طبقہ انھیں رافضی قرار دیتا ہے۔ بلکہ بعض تو انھیں کذاب بھی کہتے ہیں۔ اور جو لوگ ان کی روایات قبول کرتے ہیں، وہ بھی چند شرائط کے ساتھ قبول کرتے ہیں:

۱۔ چونکہ یہ شیعہ ہیں، لہٰذا فضائل ومناقب اور صحابہ کی مذمت میں جو روایات ہیں، وہ قبول نہیں کی جائیں گی۔

۲۔ ۲۱۰ھ میں ان کا دماغ جواب دے گیا تھا اور جو شخص بھی چاہتا، وہ ان سے حدیث کے نام سے جو چاہتا کہلوا لیتا۔ لہٰذا ۲۱۰ھ کے بعد سے ان کی تمام روایات ناقابل قبول ہیں۔

۳۔ ان سے ان کا بھانجا جو روایات نقل کرتا ہے، وہ سب منکر ہوتی ہیں۔

۴۔ یہ معمر سے روایات غلط بیان کرنے میں مشہور ہے، اور اس کی عام روایات معمر سے ہوتی ہیں۔

۵۔ ان عیوب سے پاک ہونے کے بعد اس روایت کے راوی تمام ثقہ ہوں اور سند متصل ہو تو پھر وہ روایت قابل قبول ہو گی، ورنہ نہیں۔ یہ تمام شرائط ان حضرات کے نزدیک ہیں جو اس کی روایت قبول کرتے ہیں، ورنہ محدثین کا ایک گروہ اس کے رافضی ہونے کے باعث اس کی روایت ہی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ بلکہ زید بن المبارک تو یہاں تک کہتے ہیں کہ یہ واقدی سے زیادہ جھوٹا ہے۔ تفصیل کے لیے کتب رجال ملاحظہ کیجیے۔

اب اس روایت کی معنوی حیثیت پر بھی غور فرما لیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے نور سے پیدا کیا اور پھر حضور کے نور سے تمام مخلوقات پیدا ہوئیں۔ گویا اللہ تعالیٰ لامحدود اجزا و اجسام میں تقسیم ہو گیا۔ اس لحاظ سے اس کی یہ تقسیم قیامت تک جاری رہے گی۔ اس طرح زمین وآسمان کی ہر شے اللہ کا ایک جز ہوئی۔ اور ہر

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

شے میں الوہیت کا مادہ پایا گیا۔ اور کوئی شے ایسی باقی نہیں رہی جو الوہیت سے خالی ہو۔ ایسی صورت میں اگر کوئی شخص اپنے الٰہ ہونے یا 'انا الحق' یا 'انا ربکم الاعلیٰ' کا دعویٰ کرے تو اس کا یہ دعویٰ اپنی جگہ بالکل درست ہو گا۔ اور خالق و مخلوق، عابد و معبود اور مالک و مملوک کا وہ رشتہ جو اللہ تعالیٰ نے پورے قرآن میں بیان کیا ہے، فنا ہو کر رہ جائے گا۔ یہی تو وہ کہانیاں ہیں جن پر وحدت الوجود اور ہمہ اوست کی بنیادیں قائم ہیں۔ اور جب یہ اجزا فنا ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ کی فنا بھی یقینی ہو گی۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ اجزا فنا نہیں ہوتے، بلکہ دوبارہ اللہ کی ذات میں جا کر شامل ہو جاتے ہیں تو عیسائیوں کا حضرت عیسیٰ کے بارے میں یہی تصور ہے۔ اسی سے تو تثلیث وجود میں آئی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ عیسائیوں نے اسے صرف تین کی حد تک محدود رکھا اور ہمارے صوفیا نے تمام مخلوقات کو اس کے احاطہ میں شامل کر لیا۔

پھر غور طلب یہ بھی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی ذات میں سے ایک جز علیحدہ کر دیا گیا تو دو امور تو پہلے ہی تسلیم کر لیے گئے:

۱۔ اللہ ایک ایسی شے ہے جو اجزا پر تقسیم ہو سکتی ہے اور جو شے اجزا پر تقسیم ہوتی ہو، وہ مجسم بھی ہو گی اور فنا بھی ہو گی۔ گویا اللہ تعالیٰ مجسم بھی ہے اور فانی بھی ہے۔

۲۔ جب ایک جز علیحدہ ہوا تو ذات الٰہی میں نقص لازم آیا۔ (عیاذ باللہ)

ان روایات پر منطقی لحاظ سے آپ کسی طرح بھی غور کر لیں۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی ذات پر تبرا ہے۔ عبدالرزاق سے اس کے علاوہ اور کیا توقع کی جا سکتی تھی۔ افسوس تو ہمیں اپنے علما پر ہے کہ وہ اس روایت کو حضور کی فضیلت تصور کر بیٹھے۔

اس غلط فہمی کا دور کرنا بھی ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ بذات خود ایک نور ہے۔ یہ قطعاً غلط ہے۔ نور تو اس کی ایک مخلوق ہے۔ اور مخلوق اور خالق ایک نہیں ہوتے، ورنہ پھر پہلی والی ہمہ اوست کی شکل پیدا ہو گی۔ ارشاد الٰہی ہے:

وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ. ''اس نے ظلمت اور نور کو پیدا کیا۔''

نیز ارشاد ہے:

وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِىْ بِهٖ فِى النَّاسِ. ''اور ہم نے انسان کے لیے نور پیدا کیا جس سے وہ انسانوں میں چلتا پھرتا ہے۔''

اور ارشاد ہے:

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ. ''جس کے لیے اللہ نور پیدا نہ فرمائے اسے نور کہاں سے حاصل ہوگا۔''

اور جاعل و مجعول کبھی ایک نہیں ہو سکتے، کیونکہ جاعل بمعنی خالق ہے اور مجعول بمعنی مخلوق ہے۔ اور خالق و مخلوق اور فاعل و مفعول کا ایک ہونا امر محال ہے۔ عام لوگ جو مغالطہ کھاتے ہیں، وہ اس آیت کی وجہ سے کھاتے ہیں:

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ. ''اللہ آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے۔''

حالانکہ عربی میں نور مصدر ہے اور مصدر کبھی مصدری معنی دیتا ہے، کبھی حاصل مصدر کے معنی دیتا ہے، کبھی مفعول کے اور کبھی فاعل کے۔ اسی لیے عرب مفسرین اس کا ترجمہ یہ کرتے ہیں:

اَللّٰهُ مُنَوِّرُ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ. ''اللہ آسمانوں اور زمینوں کو منور کرنے والا ہے۔''

عوام اگر دھوکا کھائیں تو اس کی کوئی اہمیت نہیں، کیونکہ وہ لاعلم ہیں، لیکن اگر علما بھی اس قسم کی باتیں کہنے لگیں تو اسے تو جہل مرکب ہی کہا جائے گا۔ جب اللہ تعالیٰ خود نور نہیں تو اس کے نور سے کسی تخلیق کا کیا سوال پیدا ہو سکتا ہے۔ سیدھے سیدھے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نور سے پیدا کیا۔ جس طرح فرشتے، لیکن یہ سراسر قرآن کی تکذیب ہے۔ وہ تو کہتا ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ طِيْنٍ. ''اور ہم نے انسان کو گارے سے پیدا کیا۔''

ہمارے نظریہ میں یہ روایت شیعوں کی وضع کردہ ہے۔ اور یہ اس لیے وضع کی گئی ہے تاکہ پنج تن پاک کی کہانیوں کی راہ ہموار ہو سکے۔ کیونکہ ان کہانیوں کی رو سے یہ نور پانچ حصوں میں تقسیم ہوا ہے۔ اور یہ روایت عبدالرزاق کے علاوہ کسی اور کتاب میں نہیں اور وہ رافضی ہے۔ لہٰذا اس نے اپنے عقیدے کی راہ ہموار کرنے کے لیے یہ روایت وضع کی کہ جب اہل سنت یہ کڑوی گولی ہضم کر لیں گے تو انھیں دوسری گولی کھلائی جائے گی۔ اور عبدالرزاق کو اب تیرہ سو سال گزر چکے ہیں۔ اتنے طویل عرصے میں تو ہم ہزارہا کڑوی گولیاں نگل چکے ہیں، بلکہ اب ہم اہل سنت اس مارفین کے ایسے عادی ہو گئے ہیں کہ اس کے خلاف کوئی بات بھی سننے کے لیے تیار نہیں۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

محمد اسحاق ناگی

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ وفات

[علامہ شبلی نعمانی کی تحقیق پر مبنی]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ وفات عام طور پر ۱۲ ربیع الاول بیان کی جاتی ہے۔ ہماری تحقیق کے مطابق وفات کی یہ تاریخ درست نہیں ہے۔ تاریخ وفات کی تعیین کے لیے اصلاً احادیث سے رجوع کیا جاتا ہے، مگر اس ضمن میں ''سیرت النبی'' کے مصنف مولانا شبلی نعمانی کا کہنا ہے کہ تلاش بسیار کے باوجود مجھے کتب احادیث سے تاریخ وفات کی ایک روایت بھی نہیں مل سکی۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ صحابۂ کرام کے دور میں اور اس کے بعد ۶۰۰ ہجری تک مسلمانوں میں یوم پیدایش یا وفات منانے کا رواج نہیں تھا۔ یہ رسم ۶۴۰ ھ میں عراق کے شہر موصل کے حکمران مظفر الدین کوکری بن اربل اور اس کے ساتھی مولوی عمر بن دحیہ الخطاب نے شروع کی۔ مورخین نے بالعموم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یوم پیدایش کے حوالے سے تو کافی بحث کی ہے، مگر تاریخ وفات کے حوالے سے مولانا شبلی نعمانی کے علاوہ کسی نے قابل ذکر گفتگو نہیں کی۔

ہماری تحقیق کے مطابق حدیث، سیرت اور تاریخ کی کتابوں کے بعض مندرجات کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح تاریخ وفات کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ موطا میں امام مالک نے عبد اللہ بن عمر کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے میدان عرفات میں جمعہ کے دن ظہر اور عصر کے درمیان کوئی نماز نہیں پڑھی۔ اس روایت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جس سال نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کیا، اس سال عرفہ (۹ ذوالحج) جمعہ کے دن ہوا تھا۔

۲۔ابن کثیر نے سورۂ مائدہ کی تفسیر میں یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک یہودی نے 'الیوم اکملت لکم دینکم' کے بارے میں حضرت عمر سے کہا کہ اگر یہ آیت ہم پر نازل ہوتی تو ہم اس دن کو یوم عید کے طور پر مناتے۔ جواب میں حضرت عمر نے فرمایا کہ اس دن ہماری دوہری عید تھی یعنی یوم عرفہ بھی تھا اور جمعہ کا دن بھی تھا۔ یہ بات ابن عباس کے حوالے سے بھی بیان ہوئی ہے کہ کسی یہودی نے مذکورہ آیت کے بارے میں درج بالا بات کہی تو انھوں نے یہی جواب دیا۔ حضرت علی اور حضرت معاویہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ ابن کثیر نے ابن عباس کے حوالے سے یہ بھی بیان کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حج کے بعد ۸۱ دن تک حیات رہے۔ (ابن کثیر ۲/۴۹)

۳۔ابوداؤد، رقم ۱۹۰۵ میں بیان ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر ۱۳ ذوالحجہ بروز منگل تک منیٰ میں قیام فرمایا۔ آپ ۱۳ ذوالحجہ ہی کو زوال کے بعد وہاں سے روانہ ہوئے۔ وادی محصب میں رات گزاری۔ بدھ کی صبح کو خانہ کعبہ کا آخری طواف کیا اور نماز فجر کے بعد مدینہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ اس سے واضح ہے کہ اگر ۱۳ ذی الحجہ کو منگل ہے تو ۹ ذی الحجہ کو لازماً جمعہ ہو گا۔

۴۔مسند احمد، رقم ۲۵۰۶ میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پیر کو پیدا ہوئے، پیر ہی کے دن منصب نبوت پر فائز ہوئے، پیر ہی کو مکہ سے ہجرت فرمائی، پیر ہی کو مدینہ منورہ تشریف لائے اور پیر ہی کو دنیا سے رخصت ہوئے۔

۵۔حضرت حسان بن ثابت کا شعر ہے:

بابی و امی من شھدت وفاتہ　　فی یوم الاثنین النبی المھتدی

''اس ہستی پر میرے ماں باپ قربان ہوں۔ پیر کے روز جن کی وفات کے وقت میں حاضر تھا۔ راہ ہدایت پر گامزن اور نبی تھے۔'' (دیوان حسان)

۶۔ابن سعد نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی علالت شروع ہونے کی دو تاریخیں ۱۹ اور ۲۹ صفر درج کی ہیں اور بدھ کا دن لکھا ہے۔ ابن ہشام نے بھی بدھ کا دن اور صفر کا مہینا لکھا ہے۔ آپ کی علالت کا دورانیہ تمام سیرت نگاروں نے ۱۳ دن بیان کیا ہے۔

۷۔جہاں تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ وفات کا تعلق ہے تو سیرت کی کتابوں میں ۱، ۲ اور ۱۲ ربیع الاول کی تاریخیں مذکور ہیں۔ یعقوبی نے ابن ہشام کے حوالہ سے سائب کلبی اور ابومخنف کی ۲ ربیع الاول والی روایت قبول کی ہے، مگر محدثین کے نزدیک یہ دونوں دروغ گو اور غیر معتبر ہیں۔ ابن سعد نے واقدی کے حوالہ سے ۱۲ ربیع الاول نقل

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

کی ہے۔ یہ بھی محدثین کے نزدیک معتوب ہے۔ یکم ربیع الاول کی روایت ثقہ ترین سیرت نگار موسیٰ بن عقبہ اور مشہور محدث امام لیث بن سعد مصری سے مروی ہے۔ (فتح الباری وفات النبی) امام السہیلی نے ''الروض الانف'' میں لکھا ہے کہ یہی روایت حقیقت سے قریب تر ہے۔

درج بالا نکات سے چار باتیں متعین ہوتی ہیں:

اولاً، ۱۰ہجری، ۹ ذوالحجہ کو جمعہ کا دن تھا۔

ثانیاً، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی علالت ۱۱ہجری، ماہ صفر میں بدھ کو شروع ہوئی۔

ثالثاً، آپ کی وفات پیر کے دن ہوئی۔

رابعاً، تاریخ وفات کے حوالے سے ۱، ۲ اور ۱۲ ربیع الاول کی تاریخیں روایت ہوئی ہیں، مگر ان میں ثقہ ترین روایت یکم ربیع الاول کی ہے۔

اب ہم اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ ماہ ربیع الاول میں پیر کا دن کن تاریخوں کو ممکن ہے۔

اگر ذوالحجہ، محرم اور صفر تینوں مہینوں کو ۳۰، ۳۰ دن کا شمار کیا جائے تو پیر کا دن ۶ اور ۱۳ تاریخ کو آتا ہے۔

اگر تینوں مہینے ۲۹، ۲۹ کے شمار کیے جائیں تو پیر ۲ اور ۹ ربیع الاول کو ہوگا۔

اگر دو مہینے ۳۰ کے اور ایک ۲۹ کا شمار کریں تو پیر ۷ اور ۱۴ کو ہوگا۔

اگر دو مہینے ۲۹ کے اور ایک ۳۰ کا شمار کریں تو پیر کا دن ۱، ۸ اور ۱۵ ربیع الاول کو ہوگا۔

ان مفروضہ تاریخوں میں سے ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۳، ۱۴ اور ۱۵ کی تائید میں کوئی روایت نہیں ہے، اس لیے یہ تاریخیں خارج از بحث ہیں۔ ۲ تاریخ کی صورت میں تینوں مہینے ۲۹، ۲۹ دن کے تصور کرنے پڑتے ہیں جو کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے۔ ۱۲ تاریخ کسی مفروضے میں بھی پیر کے دن نہیں آتی۔ اب یکم ربیع الاول کی تاریخ باقی بچتی ہے۔ اور یہی تاریخ ہے جو محدثین کے روایت و درایت کے اصولوں، اصول تقویم اور چاند کی گردش کے قانون سے مطابقت رکھتی ہے۔ ثقہ روایت میں بھی یہی تاریخ بیان ہوئی ہے۔ چاند کی گردش کے لحاظ سے بھی یہی موزوں ہے، کیونکہ اس صورت میں دو مہینے ۲۹ کے اور ایک ۳۰ کا قرار پاتا ہے۔ اس تاریخ کو درست ماننے کی صورت میں ان روایات کی بھی تطبیق ہو جاتی ہے جن کی رو سے یوم عرفہ کا دن جمعہ ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی علالت کے آغاز کا دن بدھ ہے۔ چنانچہ یہ بات زیادہ قرین حقیقت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ وفات پیر، یکم ربیع الاول ۱۱ہجری قرار دی جائے۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

خالد مسعود

اصلاح معاشرہ

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

معاشرہ کسی قوم کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کی قوت اور درستی پر قوم کے وجود، استحکام اور بقا کا انحصار ہے۔ معاشرہ کے بناؤ اور بگاڑ سے قوم براہ راست متاثر ہوتی ہے۔ معاشرہ اصلاح پذیر ہو تو اس سے ایک قومی، صحت منداور باصلاحیت قوم وجود میں آتی ہے اور اگر معاشرہ بگڑا ہوا ہو تو اس کا فساد قوم کو گھن کی طرح کھا جاتا ہے۔

معاشرے کا کردار بننے یا بگڑنے کا عمل فی الفور مکمل نہیں ہو جاتا، بلکہ اس میں طویل مدت صرف ہوتی ہے۔ بگاڑ کی راہ پر چلنے والے معاشرہ میں اچھی اقدار ایک ایک کر کے منہدم ہوتی چلی جاتی ہیں۔ نیک و بد کے بارے میں شدید احساس رکھنے والے لوگ تو اس خرابی کو جلد بھانپ جاتے ہیں، لیکن عام لوگوں پر یہ مدتوں کے بعد کھلتی ہے۔ اسی طرح معاشرہ کی اصلاح کا کام بھی ہے۔ جس طرح ایک بنیاد اٹھا کر اس پر ایک ایک اینٹ جوڑنے سے دیوار مکمل ہوتی ہے۔ اسی طرح اصلاح کا کام بھی ایک تعمیر کی منصوبہ بندی چاہتا ہے۔ جب یہ کام منصوبہ بندی کے بغیر کیا جائے تو اس کی کامیابی محل نظر ہوتی ہے۔

قرآن مجید نے قوموں کے عروج و زوال کی جو تاریخ بیان کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قومیں جب بھی خدا اور آخرت کے تصور سے بے نیاز ہوتی ہیں یا ان کا یہ تصور ناقص ہوا ہے اور ان میں اخلاقی مفاسد سرایت کر گئے ہیں تو اگر قوم میں اصلاح احوال کا جذبہ پیدا نہیں ہوا تو وہ ہمیشہ برباد ہو گئی ہے۔ اس کی تباہی میں اس سوال کو کبھی کوئی اہمیت نہیں رہی کہ اس کے فساد کی نوعیت کیا ہے، بلکہ ہر برا عمل، خواہ اس کی نوعیت اس تکبر کی رہی ہو جو عاد اور ثمود میں تھا، اس اخلاقی گراوٹ کی رہی ہو جو قوم لوط میں پائی جاتی تھی یا اس تاجرانہ بدمعاملگی اور بددیانتی کی ہو جس کا مظاہرہ

قوم شعیب نے کیا، جب بھی وہ معاشرہ کا اجتماعی کردار بن گیا تو اس کی موت کا پیغام لے آیا۔ قرآن مجید کے اس فلسفہ کی رو سے ایک قوم کے برمند ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ معاشرہ کے اندر خدا کا خوف اور اس کے ساتھ صحیح بنیادوں پر تعلق پایا جائے۔ دلوں میں آخرت کے محاسبہ کا اندیشہ موجود ہو اور کسی بھی قسم کے فساد اعمال کو معاشرہ پر مسلط ہونے کا موقع نہ دیا جائے۔ یہ مقصد ظاہر ہے کہ صرف اس صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب قوم کے اندر اصلاح معاشرہ کے لیے ایک مسلسل جدوجہد کی جاتی رہے۔ اور کسی بھی فساد کے معاملے میں چشم پوشی سے کام لے کر اسے قوم کے اجتماعی وجود میں راہ پانے کا موقع نہ دیا جائے۔

معاشرہ کے اندر جب فساد راہ پا جاتا ہے تو اس کا ظہور نہ تو کسی ایک ہی شکل میں ہوتا اور نہ کسی ایک ہی طبقہ تک محدود رہتا ہے۔ بلکہ ہر شعبۂ زندگی اور قوم کا ہر طبقہ اس سے متاثر ہوتا ہے۔ قوم کے سنجیدہ عناصر جب اصلاح احوال کے لیے فکر مند ہوتے ہیں تو متنوع مفاسد پر گرفت کے لیے انھیں کوئی طریقہ سجھائی نہیں دیتا۔ وہ خرابی کی ہمہ گیری کو دیکھتے ہوئے اشتہار بازی کا سہارا لیتے ہیں اور اس طرح دل کو تسلی دے لیتے ہیں کہ انھوں نے قوم کی اصلاح کا حق ادا کر دیا۔ بااختیار طبقہ اخلاقی فساد کا علاج نگران ادارے قائم کر کے کرنا چاہتا ہے۔ رشوت ستانی کو فروغ پاتے دیکھتا ہے تو اس کے انسداد کا محکمہ بنا دیتا ہے۔ ملاوٹ اور چور بازاری کی وبا کو دیکھتا ہے تو چھاپہ مار عملہ ترتیب دے کر اس پر قابو پانا چاہتا ہے۔ حکومت کے کارکنوں میں بدعنوانی کی گرم بازاری دیکھتا ہے تو قواعد وضوابط میں ترامیم کا سہارا لیتا ہے۔ اصلاحی کمیٹیاں قائم کی جاتی ہیں کہ وہ اس ہمہ گیر فساد پر قابو پانے کے لیے سفارشات پیش کریں۔ اس ساری سرگرمی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زندگی کے ہر دائرے میں ادارے اور تنظیمیں تو قائم ہوتی چلی جاتی ہیں، لیکن بات جہاں تھی وہیں رہتی ہے۔ بلکہ مفاسد نت نئی شکل اختیار کرتے سامنے آتے ہیں اور معاشرہ میں مزید پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام نگران اداروں اور تنظیموں کا عملہ اسی مفسد معاشرہ سے آتا ہے۔ وہ نہایت آسانی سے خود انھی خرابیوں کا شکار ہو جاتا ہے جن کی روک تھام کے لیے اس کا تقرر کیا گیا تھا۔

ہمارے نزدیک کسی بھی بیماری کا صحیح علاج صرف اس وقت ممکن ہوتا ہے جب اس کے اسباب کا صحیح طور پر تعین کر لیا جائے۔ معاشرہ کے فساد کے اسباب کے تعین میں بالعموم غلطی کی جاتی ہے۔ کوئی جرم یا گناہ بلاوجہ صادر نہیں ہوتا، بلکہ اس کے مرتکب کے دل میں خداوند تعالیٰ کے ساتھ تعلق کی کمی، تصور آخرت کے شعور میں غلطی اور دنیا کی محبت اس کا سبب بنتی ہے۔ یہ بنیادی سبب پایا جائے تو پھر ہر شعبۂ زندگی میں فساد کی اقسام کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ انسانی ذہن بڑا زرخیز ہے۔ وہ ایک سے ایک بڑھ کر جرائم کی انوکھی اور نت نئی شکلیں اختیار کر لیتا ہے۔ لہٰذا جب تک لوگوں کی

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

تربیت اس نہج پر کرنے کا انتظام نہ کیا جائے کہ وہ خدا کے ساتھ اپنے تعلق کو سمجھنے کے قابل ہو جائیں، دنیا کے بارے میں ان کا تصور ذمہ دارانہ ہو جائے اور وہ یہ شدید احساس رکھتے ہوں کہ آخرت میں ان کے تمام اعمال کی باز پرس ہونے والی ہے جس کا نتیجہ ابدی عذاب کی صورت میں بھی نکل سکتا ہے، لہٰذا ان کی فلاح اچھے کردار کو اپنانے ہی سے وابستہ ہے، اس وقت تک ان کی اصلاح کی توقع رکھنا عبث ہے۔

صحیح بنیاد پر اصلاح معاشرہ کا بیڑہ اٹھایا جائے تو اس کی طرف پہلا قدم ایک فرد کی اصلاح کرنا ہوگا یعنی معاشرہ کے ہر فرد کے ذہن میں ان حقائق کو راسخ کیا جائے جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ صحیح علم ہی سے صحیح عمل پیدا ہوسکتا ہے۔ اس لیے موت وحیات کے اصل حقائق کے راسخ علم سے فرد کے اندر تقویٰ، پرہیز گاری، خشیت الٰہی اور خوف آخرت پیدا ہوگا۔ ایک فرد کے دل کا یہ نور اس کے اخلاق و کردار کے تمام گوشوں کو روشن کر دے گا اور آپ سے آپ اس کی عملی اصلاح کے آثار پیدا ہو جائیں گے۔

ایک فرد کے اندر کا یہ نور اس کی ذات تک محدود نہیں رہتا، بلکہ اس سے اس کا قریبی ماحول اور کنبہ مستنیز ہوتا ہے۔ ایسا فرد اپنے بیوی بچوں اور متعلقین کو گمراہی میں نہیں دیکھ سکتا۔ اسے اس ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے کہ اسے ایک گلے کی نگرانی کا کام سونپا گیا ہے۔ اگر گلے کی ایک بھیڑ بھی ریوڑ سے کٹ کر بھٹک جائے گی تو اس کا مالک اس کی نالائقی پر ناراض ہوگا۔ لہٰذا ایسا شخص اپنے زیر اثر لوگوں کی فکری و اخلاقی اصلاح کے لیے ہر وقت کوشاں رہتا ہے۔ اس کا یہ عمل معاشرہ کی اصلاح کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

اہل دنیا کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ پورے کا پورا معاشرہ غیر ذمہ دار اور خدا اور آخرت سے بے نیاز ہو جائے اور ان کو ٹوکنے والا اور برا سمجھنے والا کوئی نہ رہے۔ اس کے برعکس اہل دین کو یہ ذمہ داری بتائی گئی ہے کہ وہ اپنے اپنے حلقۂ اثر میں برائی کے نفوذ کی مزاحمت کریں اور لوگوں میں نیکی اور بھلائی کو رواج دینے کی مثبت کوشش کریں۔ اس سلسلے میں جو شخص جتنا با اثر ہوتا ہے اس کی ذمہ داری اسی قدر زیادہ بتائی گئی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے جو شخص کسی کو برائی کرتا دیکھے تو وہ اگر با اثر ہو تو طاقت سے اس کا قلع قمع کر دے۔ اگر وہ ایسا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تو اپنی زبان سے لوگوں کو قائل کرے کہ وہ اس برائی کو ترک کر دیں اور نیکی اختیار کریں۔ اگر وہ برائی کے خلاف زبان کھولنے سے بھی معذور ہے، تو اس کے ایمان کا کم سے کم تقاضا یہ ہے کہ وہ اس برائی سے دل میں نفرت رکھے اور اس کی آلودگی سے اپنا دامن بچائے رکھے۔ ایمان رکھتے ہوئے اس سے کم تر کسی کردار کا مظاہرہ کرنا کسی مسلمان کو زیب نہیں دیتا۔

اصلاح معاشرہ کی اس تحریک میں جو فرد کی اصلاح کو مقصد بنائے، ہر نیک آدمی اور ہر مذہبی وسماجی ادارہ حصہ لے سکتا ہے۔ دینی مدارس، اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں اس میں ممد ثابت ہوسکتی ہیں۔ صحیح الفکر سیاسی جماعتیں بھی یہ کام کرسکتی ہیں اور یہ تحریک معاشرے کے ایک مستقل پروگرام کے طور پر جاری رہ سکتی ہے۔ اس تحریک میں ارباب حکومت کا یہ حصہ ہوتا ہے کہ وہ اصلاح کی تمام کوششوں کو تقویت دینے اور نتیجہ خیز بنانے کے لیے پالیسیاں بنائیں اور اس طرز فکر کی حوصلہ شکنی کریں جو اس کی راہ میں رکاوٹ بن رہا ہو۔ وہ ملک میں ایسا تعلیمی نظام رائج کریں جو اصل حقائق زندگی سے لوگوں کو روشناس کرا کر ان کو ذمہ دار شہری بنائے اور ان میں خوف خدا اور خوف آخرت پیدا کردے۔ ان لوگوں پر ان کی گرفت بڑی سخت ہو جو معاشرے میں فساد کا بیج بوئیں۔ وہ حکومت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ایک مستقل شعبہ قائم کریں جس کے پیش نظر مقصد ہی یہ ہو کہ وہ نیکیوں اور بھلائیوں کی طرف ترغیب دے اور برائیوں کو مٹانے کے لیے کمر بستہ رہے۔ ان کا عدالتی نظام جرائم کی سزا جلد دینے کا قائل ہو اور مقدمات کو طول دے کر فیصلوں میں تاخیر نہ کرے۔

یہ تو ہے اصلاح معاشرہ کا اصل طویل المیعاد پروگرام جس سے مطلوبہ نتائج حاصل ہونے کی توقع ہوسکتی ہے، لیکن امت مسلمہ کے اچھے حکمرانوں نے اپنے اوپر بعض پابندیاں عائد کرکے بھی اپنی رعایا کے لیے اچھی تربیت کا سامان فراہم کیا۔ عوام اپنے حکمرانوں کی تقلید کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں اور ان کی پسند معاشرے کا فیشن قرار پاتی ہے۔ چنانچہ خلفاے راشدین نے اپنا معیار زندگی ہمیشہ اتنا پست رکھا کہ ان میں اور ایک کم آمدنی والے کارکن کے معیار زندگی میں کوئی فرق نظر نہ آتا تھا۔ ان کی نگاہ میں امیر اور غریب، دونوں کو یکساں قدر و منزلت حاصل تھی۔ وہ جہاں دولت کا مظاہرہ دیکھتے فوراً اس کی حوصلہ شکنی کرتے۔ خلفاے راشدین کے اس طرز عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ کثرت مال معاشرے میں باعث عزت نہ تھی، حصول زر زندگیوں کا مقصد نہ بنا اور امیر و غریب کے تفاوت نے معاشرتی بے انصافیوں کو جنم نہیں دیا۔

خلفاے راشدین کے دور کی دوسری بڑی خصوصیت قانون کا عادلانہ نفاذ تھا۔ جس کے لیے وہ ہمیشہ مستعد رہتے تھے۔ وہ نفاذ قانون میں نہ عمال حکومت کا لحاظ کرتے تھے اور نہ اپنے اعزا و اقارب کا۔ درۂ عمر کو جو شہرت حاصل ہوئی ہے وہ اس بنا پر نہیں کہ خدانخواستہ حضرت عمر لوگوں کو اپنے منصبی تفوق اور اختیارات کا احساس دلانے کے لیے ان پر ناروا یہ درہ برسایا کرتے تھے۔ بلکہ یہ شہرت اس بنیاد پر ہے کہ یہ درہ اس وقت بلا تاخیر حرکت میں آجاتا تھا جب کوئی شخص قانون سے بے پروائی کا اظہار کرتا، کسی کمزور پر ظلم کرتا یا اخلاقی تربیت کے لیے اسے تادیب کی ضرورت

www.javedahmadghamidi.com

ہوتی۔ درۂ عمر حضرت عمر کی فرض شناسی، بیدار مغزی، معدلت گستری اور قانون و اخلاق کی پاس داری کی ایک علامت تھا۔

ملک کے حکمرانوں کے اندر جب یہ صفات پیدا ہو جائیں تو ان کی رعایا کے لیے یہ قابل تقلید نمونہ بن جاتی ہیں۔ وہ جب دیکھتے ہیں کہ ان کے حکمران وسائل پر اختیار رکھتے ہوئے زندگی کی آسایشوں سے اپنے آپ کو محروم رکھے ہوئے ہیں۔ وہ دولت سمیٹنے کی کوئی آرزو نہیں رکھتے، محض امارت باعث عزت تصور نہیں کی جاتی۔ قانون و اخلاق کی بالادستی قائم رکھی جاتی ہے۔ اور عدل و انصاف کے تقاضوں سے حکمران اپنی ذات کو بھی مستثنیٰ قرار نہیں دیتے تو یہی رسم حکومت کے اہل کاروں اور عوام میں بھی چل پڑتی ہے۔

ارباب حکومت کے علاوہ معاشرے کے دوسرے سربرآوردہ لوگ، خواہ وہ سیاسی میدان سے تعلق رکھتے ہوں یا مذہبی، سماجی یا دوسرے طبقات سے، وہ بھی اپنے طرز عمل سے اپنے اپنے حلقۂ اثر میں پسندیدہ طرز زندگی کو رواج دینے کی طرح ڈال سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ اپنے اوپر چند پابندیاں عائد کریں اور ایسے فلسفۂ زندگی کا پرچار کریں جس کے نتیجہ میں اخلاقی فساد کی راہیں مسدود کی جاسکتی ہوں۔ عوام الناس چونکہ بڑوں کے طریقہ سے فوراً متاثر ہوتے اور ان کی تقلید میں عزت محسوس کرتے ہیں، اس لیے اصلاح معاشرہ کے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے یہ طریقہ قلیل المیعاد اور نسبتاً آسان ہے۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

خالد مسعود

کارِرسالت کے لیے تربیت

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

[''سیر وسوانح'' کے زیرعنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

نبوت ورسالت کا منصب اپنے ساتھ بہت بڑی ذمہ داریاں لاتا ہے، لہٰذا جس شخص کو اللہ تعالیٰ یہ منصب عطا کرنا چاہتا ہے، اس کی پیدایش ہی سے اس کی خاص تربیت فرماتا ہے۔ نبی کا کام لوگوں کو حقوق اللہ اور حقوق العباد کے تقاضوں سے آگاہ کرنا، احکام الٰہی کی یاددہانی کرنا اور جو ہدایات وحی سے ملیں ان سے اپنے مخاطبوں کو باخبر کرنا ہوتا ہے۔ چونکہ لوگوں کے لیے نبی کی دعوت ان کے مفادات پر ضرب لگانے والی ہوتی ہے، اس لیے اس سے مخاطبین بالعموم اور طبقۂ خواص بالخصوص بدکتے اور بالآخر اس کے مخالف بن کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اگر نبی نے مشکل حالات کا خود سامنا نہ کیا ہو اور لوگوں کی زیادتیوں سے اسے واسطہ نہ پڑا ہو، نیز وہ انسانوں کی نفسیات سے آگاہ نہ ہو تو کارنبوت کے ادا کرنے میں اسے مشکلات پیش آسکتی ہیں۔ لہٰذا اس کی تربیت میں اس طرح کے عناصر شامل کر دیے جاتے ہیں جن سے واقف ہو کر وہ عملی زندگی میں اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہو سکے۔ یہ تربیت اللہ کریم کی براہ راست نگرانی میں ہوتی ہے۔ اس لیے وہ ہونے والے نبی کو خاص امداد فراہم کرتا اور اس کو مشکلات سے نکالنے کے لیے غیر معمولی انتظامات بروے کار لاتا ہے۔

مصر کا حکمران فرعون ایک بے حد ظالم اور سفاک حکمران تھا جو اپنے آپ کو رب اعلیٰ کے طور پر لوگوں سے منواتا

تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس کے سامنے تبلیغ دین پر مامور کرنے کا فیصلہ ہوا تو انتہائی دشوار اور سنگین حالات میں ان کو پیدا کیا گیا۔ یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام کے خاندان کے بچوں کو پیدا ہوتے ہی مار ڈالنے کا حکم اس وقت مملکت مصر میں نافذ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے دل میں یہ بات ڈالی کہ وہ ایک ٹوکری کے سوراخ بند کر کے اپنے نومولود بچے کو اس میں ڈال کر دریا میں بہا دے۔ پھر دیکھے کہ پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔ ٹوکری دریا میں بہتی ہوئی فرعون کے محل کے قریب ہوئی تو فرعون کی بے اولاد بیوی کی نظر اس پر پڑ گئی۔ اس نے ٹوکری پانی سے نکلوائی تو اس میں ایک من موہنا بچہ دیکھ کر مچل گئی کہ وہ اس کو بیٹا بنا کر خود پالے گی۔ اس طرح موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے دربار میں اور ملک کے صف اول کے لوگوں کے درمیان پرورش پانے، ان کے طور طریقے سمجھنے اور ان کی نفسیات سے آگاہی حاصل کرنے کا موقع ملا۔ ان کو مصر کے قبطی باشندوں اور بنی اسرائیل کے قبائل، جو کنعان سے آ کر مصر میں آباد ہو چکے تھے، کے درمیان کی آویزش، اسرائیلیوں کی مظلومیت اور بے بسی اور مصریوں کے ظلم وتشدد کو دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ ایک مرتبہ شہر کو نکل گئے تو ایک مصری کو ایک کنعانی پر تشدد کرتے دیکھا۔ انھوں نے کنعانی کو چھڑانے کی خاطر مصری کو گھونسا مارا تو وہ غیر ارادی طور پر جسم کی کسی ایسی جگہ لگا جس سے وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ موسیٰ علیہ السلام اس خلاف توقع صورت حال پر سخت نادم ہوئے۔ اللہ سے معافی مانگی اور اپنے ایک خیر خواہ مصری درباری کے مشورہ سے شہر سے نکل گئے۔ طویل سفر کے بعد وہ مدین پہنچے جہاں ان کو ٹھکانا نصیب ہوا۔ انھوں نے وہاں رہ کر بکریوں کے ریوڑ چرائے اور ان کے مالک کی صحبت سے نیکی کی تبلیغ کا فن سیکھا۔ یہ تمام تجربات ایسے تھے جنھوں نے ان کی شخصیت میں نکھار اور طبیعت میں ٹھیراؤ پیدا کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس تربیت میں سے گزار چکا تو انھیں پیغمبری عطا کی، فرعون کے دربار میں جا کر دین کی تبلیغ کا حکم دیا اور انھیں اپنے اس فضل سے بھی آگاہ فرمایا کہ میں نے اپنی دعوت کے لیے تمھاری خاص تربیت کی۔ 'وَاصۡطَنَعۡتُكَ لِنَفۡسِيۡ'۔ (طٰہٰ ۲۰: ۴۱)

حضرت یوسف علیہ السلام اپنے لڑکپن ہی سے اپنے سوتیلے بھائیوں کی زیادتیوں کا نشانہ بنے، جس سے ان کو تحمل و برداشت کی تربیت ملی۔ بھائیوں نے ان سے چھٹکارا پانے کے لیے ان کو اندھے کنویں میں ڈال دیا تو اللہ نے ان کی حفاظت فرمائی اور ان کو مصر کے ایک رئیس کی غلامی میں دے دیا۔ وہاں انھیں مالک کی جاگیر کی نگرانی، کاشت کاری کے طور طریقوں اور غلے کی برداشت اور ذخیرہ کی تربیت ملی۔ وہ غلامی کے مسائل سے دوچار ہوئے۔ انھیں بے گناہ قید و بند کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں۔ اس طرح انھیں زندگی کے معاملات کے تجربہ، تقویٰ اور صبر واستقامت کی تربیت میسر آئی جس کو وہ آیندہ زندگی میں، جب وہ قید خانے سے سرخ رو ہو کر نکلے، بروے کار لائے۔

حضور کی یتیمی

ہمارے رسول اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ کی اسی سنت کے تحت معاملہ ہوا۔ وہ پیدا ہوئے تو والد کے وفات پا جانے کے باعث ان کے سایۂ عاطفت سے محروم تھے۔ عرب سوسائٹی میں یتیم بچوں سے ہر زیادتی روا رکھی جاتی تھی۔ وہ بے آسرا اور بے سہارا ہوتے، طاقت ور رشتہ داران کے حصہ کی جائداد ہڑپ کر جاتے یا حیلے بہانوں سے ہتھیا لیتے، لہٰذا غربت اور تنگ دستی ان کا مقدر بن جاتی۔

حضور کو بچپن میں یتیمی کے باعث جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ان کی تفصیل سے سیرت نگار واقف نہیں ہو سکے۔ تاہم یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی زندگی بڑی پر مشقت تھی۔ قریش کے رواج کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ نے کسی دایہ سے بچے کو دودھ پلوانے کے لیے جب بنی سعد کی عورتوں سے معاملہ کرنے کی کوشش کی تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک یتیم بچہ ہونے کے باعث دودھ پلانے پر راضی نہ ہوئیں۔ بالآخر ایک غریب دایہ حلیمہ نے آپ کو قبول کر لیا۔

صحرا میں چند سال گزارنے کے بعد آپ کو واپس مکہ لایا گیا تو آپ کو اپنی والدہ آمنہ کی آغوش محبت ملی۔ لیکن یہ سکون کا عرصہ نہایت مختصر ثابت ہوا۔ والدہ آپ کو یثرب لے گئیں تو مکہ کو لوٹتے ہوئے ابوا کے مقام پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ کا انتقال ہو گیا اور آپ کو دوہری یتیمی کے صدمہ سے دوچار ہونا پڑا۔ ماں زندہ رہتیں تو آپ کی پرورش، نشوونما اور معاشرہ میں آپ کو مقام دلوانے کی تدبیریں کرتیں۔ اب یہ سہارا بھی باقی نہ رہا۔ اب دادا عبدالمطلب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سر پر دست شفقت رکھنے لگے۔ یہ صورت حال دو برس ہی قائم رہ سکی اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر آٹھ سال تھی تو دادا کا انتقال ہو گیا۔ اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم بنو ہاشم خاندان کا ایک فرد ہونے کے باعث قبیلہ کی عمومی تولیت میں ضرور تھے، لیکن آپ کو زندگی کی جدوجہد میں بہرحال خود ہی اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا تھا۔ آپ کے والد کا انتقال عین جوانی میں ہوا تھا اور انھوں نے کوئی قابل ذکر ترکہ نہیں چھوڑا تھا۔ شاید یہی وہ زمانہ ہے جس کے بارے میں دوسرے رسولوں کے بکریاں چرانے کے حوالہ سے آپ نے فرمایا کہ میں بھی مکہ میں خاندان کی بکریاں چراتا رہا ہوں۔

ایک چرواہا بڑے انہماک سے اپنے ریوڑ کی ہر بکری اور ہر بھیڑ پر نظر رکھتا ہے۔ ان میں سے کوئی بھیڑ یا بکری بیمار ہو، چل نہ سکتی ہو یا چر نہ رہی ہو تو وہ چرواہے کی توجہ کی خاص طور پر مستحق ہوتی ہے اور وہ اس کی خصوصی دیکھ بھال کرنے لگتا ہے۔ کوئی بکری ریوڑ سے الگ ہو جائے تو وہ اس کو ڈھونڈتا اور گھیر گھار کر واپس ریوڑ میں شامل کرتا ہے۔

اگر چراگاہ کے اردگرد بھیڑیے پائے جاتے ہوں اور وہ ریوڑ پر حملہ آور ہوتے ہوں تو وہ چرواہا ان کو بھگانے کے لیے مناسب سروسامان اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ یہ طرزِ عمل آدمی کے کردار کی بھی تعمیر کرتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی کے منصب پر فائز ہونے والوں کو گلہ بانی سے اس لیے وابستہ کرتا رہا کہ وہ آگے چل کر اپنے صاحب ایمان ساتھیوں کی دیکھ بھال کرنے اور ان کو شیاطین کے حملوں سے بچانے کی تربیت حاصل کر لیں۔ چنانچہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد بھی فرمایا کہ:

''تم میں سے ہر شخص ایک چرواہا ہے اور اس سے اس کے گلے کے بارے میں باز پرس ہوگی۔''[1]

اسی تربیت کے باعث حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ سے فرداً فرداً رابطہ رکھتے، ان کے دکھ درد میں شریک ہوتے، ان کی خوشیوں پر ان کو مبارک باد دیتے اور حسب حال ان کی تربیت فرماتے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

کسب معاش

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر جب معاشی جدوجہد میں باقاعدہ حصہ لینے کی ہوئی تو دوسرے قرشی نوجوانوں کی طرح آپ بھی تجارتی سفروں پر جانے لگے۔ ان تجارتی سفروں سے آپ کو ممالک کے دیکھنے، وہاں کے باشندوں کے طور طریقے جاننے اور تجارت و معاملت کے انداز سیکھنے کا موقع ملا۔ یہ تربیت، جس کا موقع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نوعمری ہی میں پیدا ہو گیا، بڑی قدر و قیمت کی چیز ہے۔ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ملک کے بیش تر حصوں کے بارے میں براہ راست معلومات حاصل ہوئیں۔ پھر مختلف علاقوں کے لوگوں کے مزاج، کردار، نفسیات اور رسوم و رواج کا علم ہوا اور ان سے بات چیت کرنے اور معاملات طے کرنے کا تجربہ حاصل ہوا۔ یہ تربیت اس وقت آپ کے کام آئی جب آپ اللہ کے دین کی دعوت پھیلانے پر مامور ہوئے اور اس سلسلہ میں افراد اور وفود کے ساتھ آپ کے مذاکرات ہونے لگے۔

حمایت مظلوم

اپنے لڑکپن ہی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اچھے لوگوں کے ساتھ نشست و برخاست کا موقع ملا۔ معاشرہ کے اندر صالح نوجوان آپ کے دوست تھے۔ بڑوں میں بھی اعلیٰ کردار کے مالک لوگوں کے مشوروں اور منصوبوں میں شریک

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الامارہ۔ باب فضیلۃ الامام العادل ۱۲۵/۲۔

ہونے کا آپ کو موقع ملا۔ جب آپ صرف بیس برس کے تھے تو ان اکابر کے اس حلف میں شریک ہوئے جس کا نام 'حلف الفضول' ہے۔ حمایت مظلوم کے لیے قائم اس سوسائٹی کا معاشرے پر نہایت اچھا اثر پڑا اور رحم دلی اور غریبوں کی دادرسی کا چلن عام ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلیٰ مقاصد کے لیے قائم اس سوسائٹی سے جو تربیت پائی اور اس کے لیے جو خدمات سرانجام دیں، آپ بعد کی زندگی میں بھی ان کا تذکرہ کرکے مسرت حاصل کرتے۔

نبی کی تربیت کے لیے جہاں اللہ تعالیٰ اس کو سخت حالات میں سے گزارتا ہے، وہیں اپنی غیر معمولی شانیں بھی ظاہر کرتا ہے جن کی بدولت نبی پر کوئی آنچ نہیں آنے پاتی۔ فرعون کی ظالمانہ پالیسیاں اور قتل کی اسکیمیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بال بیکا نہ کرسکیں۔ اسی طرح باپ اور ماں، دونوں کی شفقت سے محروم ہونے کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب، تایا زبیر اور ابوطالب نے آپ سے محبت کا رویہ رکھا اور سہارا دیا۔ یتیم بچوں کو معاشرہ بالعموم اٹھنے میں مدد نہیں دیتا۔ کسب معاش میں ان کو غیر معمولی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کسب معاش کی راہیں کھلتی اور آسانیاں پیدا ہوتی گئیں، اگرچہ آپ کو اصل دولت اس غنا کی حاصل تھی جس کا تعلق دل کے احوال سے ہوتا ہے، محض مادی وسائل سے نہیں ہوتا۔ انھی انعامات کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن نے ایک موقع پر حضور کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی...وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی. (الضحیٰ ۹۳: ۶-۸)	''کیا اس نے تجھے یتیم نہ پایا تو اس نے ٹھکانا دیا... اور کیا اس نے تمھیں محتاج نہ پایا تو غنی کردیا۔''

مقصد یہ تھا کہ آپ ان انعامات کو یاد رکھیں اور ان کے شکریہ کے طور پر ایسا رویہ اختیار کریں کہ جس سے یتیموں کو سرپرستی حاصل ہو، غریبوں اور محتاجوں کے ساتھ ہمدردی اور ان کی خیر خواہی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کمزوروں سے مواسات اور ہمدردی، غلاموں کی آزادی کی تدابیر اور یتیموں سے محبت نہایت نمایاں نظر آتی ہے۔

دینی رجحان

نبیوں کی تربیت کا ایک پہلو یہ بھی رہا کہ وہ جس ماحول میں تبلیغ کے لیے مبعوث کیے جانے والے ہوتے اللہ تعالیٰ ان کو اس سے پوری طرح آگاہ کرنے کا سامان کردیتا۔ وہ اپنے مخاطبوں کے عقائد، محبوبات، کردار کے اچھے اور برے پہلوؤں اور اخلاقی کمزوریوں سے بخوبی آشنا ہوتے۔ وہ لوگوں کے انداز فکر اور نفسیات کو بھی خوب سمجھتے۔ مثال

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

کے طور پر حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم تجارت پیشہ تھی تو وہ خود بھی اسی پیشہ سے منسلک اور کاروبار میں لوگوں کی بد دیانتیوں اور زیادتیوں سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول مبعوث ہونے کے بعد جب انھوں نے اپنی قوم کی پیشہ ورانہ بد دیانتیوں کو بے نقاب کر کے ان کو بھلائی کی راہ اختیار کرنے کی دعوت دی تو ان کی قوم نے ان کو یہ طعنہ دیا کہ تم ہمارے کاروبار پر اخلاقی قیدیں لگا کر خود اپنی تجارت چمکانا چاہتے ہو۔ قوم حضرت شعیب علیہ السلام کی معاملہ فہمی اور کاروباری بصیرت سے آگاہ تھی۔ اس لیے لوگ ان سے کہتے کہ ہم تو یہ توقع رکھتے تھے کہ تم اپنے تجربہ و بصیرت سے اپنی پوری قوم کو فائدہ پہنچاؤ گے، لیکن تم تو ہمیں خود اپنے مالوں میں مرضی کا تصرف کرنے سے بھی روکتے ہو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس خانوادے میں پیدا کیا گیا جو بتوں کا پجاری ہی نہیں، بلکہ بت گر اور بت خانوں کا منتظم بھی تھا۔ اس ماحول میں پرورش پا کر سیدنا ابراہیم بتوں کے لیے قوم کی عقیدت مندیوں اور مشرکانہ عقائد کے ہر ہر پہلو سے واقف ہو گئے۔ چنانچہ انھوں نے بعثت کے بعد جب قوم کو توحید کی دعوت دی تو ایک مرحلہ میں بت خانہ میں اپنی رسائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قوم کو سبق سکھانے کے لیے انھوں نے ان کے بتوں کو توڑ ڈالا اور ان کو ان کے غلط موقف کا عملی ثبوت پیش کر دیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت چونکہ بنی اسماعیل میں ہونے والی تھی اور آپ نے ملت ابراہیم کو از سر نو زندہ کرنا تھا، لہٰذا آپ کو بنو اسماعیل کی مرکزی بستی مکہ میں ان کے معزز اور حکمران خانوادے قریش میں پیدا کیا گیا۔ آپ نے اپنی قوم کے بتوں پر انحصار اور ان کی عقیدتوں کے مراجع سے پوری واقفیت حاصل کر لی۔ آپ ملت ابراہیم میں کی گئی خیانتوں پر مطلع ہو گئے۔ مکہ میں پورے عرب سے اکٹھے ہونے والے تمام قبائل کے بارے میں آپ کی معلومات میں بے حد اضافہ ہو گیا جس سے آپ نے نبوت پانے کے بعد بھرپور فائدہ اٹھایا۔

قرآن مجید کا بیان ہے کہ جب قوم پر اتمام حجت کے طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بت توڑنے کی کارروائی کی تو قوم نے ان کو سزا دینے کے لیے آگ کا الاؤ تیار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو اس آگ سے محفوظ رکھا اور ان کو ہجرت کا حکم دیا۔ اس موقع پر جاتے جاتے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم اور اس کے شرک سے برملا اظہار بے زاری کیا۔ یہ اعلان اللہ تعالیٰ کو اس قدر پسند آیا کہ اس کو 'کلمۃ باقیۃ فی عقبہ' یعنی ان کی نسل میں ایک پائیدار اور باقی رہنے والی روایت کے طور پر زندہ رکھا۔ اچھے اسلاف اپنے اخلاف کو یہ روایت منتقل کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ امتداد زمانہ کے باوجود اور اس حقیقت کے باوصف کہ بنی اسماعیل میں شرک سرایت کر چکا تھا، ایک گروہ دین حنفی کا پیرو، اپنے جد امجد کی دعوت توحید کا حامل اور ان کی شرک بے زاری کی روایت کا امین رہا۔ یہی وہ گروہ تھا

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

جو زمانۂ جاہلیت میں 'حنیف' کے طور پر پہچانا جاتا تھا۔ یہ لوگ بیت اللہ اور اس کے پاس کی جانے والی عبادات کے شیدائی تھے اور ان میں روا رکھی جانے والی بدعات کو ہدف تنقید بناتے تھے۔ دین ابراہیم کی جو روایت اپنی اصل شکل میں ان کے علم میں آتی اس پر کاربند ہوتے۔ ان میں امانت و دیانت، عفت و پاکیزگی، غریبوں سے ہمدردی، ہر خیر میں تعاون اور ہر شر سے اجتناب کی صفات موجود تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نزول وحی سے قبل اسی حنیف گروہ کے ایک نمایاں فرد تھے۔ آپ قوم کی مشرکانہ عبادات اور قبیح سرگرمیوں میں ہرگز حصہ نہ لیتے۔ سچائی، امانت اور دیانت آپ کا شیوہ تھا۔ اس اعتبار سے قوم آپ کی قدردان تھی۔

حقیقت کی جستجو

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ انسان کی رہنمائی کا اولین ذریعہ اس کی اپنی فطرت کی آواز ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ جن شخصیات کو منصب نبوت کے لیے چن لیتا ہے وہ آغاز ہی سے فطرت سلیم کی روشنی سے بہرہ ور ہوتی ہیں۔ یہ لوگ اللہ کی وحدانیت اور آخرت پر اجمالی ایمان رکھنے کے علاوہ اس نیک و بد اور حلال و حرام سے بخوبی آگاہ ہوتے ہیں جس کی تعلیم فطرت کے اندر مرتسم کر دی گئی ہے۔ اس کے باوجود ان کے اندر ایسی آتش شوق فروزاں ہوتی ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ حقیقت واشگاف انداز میں ان کے سامنے آ ئے، وہ پورے شرح صدر کے ساتھ اس کو اپنائیں اور اس کو اپنے لیے مشعل راہ بنائیں۔ سورۂ ہود میں بیان ہوا ہے کہ حضرت صالح اور حضرت شعیب علیہما السلام، دونوں نے اپنی قوموں کو بتایا کہ ہم رسول بنائے جانے سے پہلے بھی ایک 'بیـــنة' (واضح دلیل) پر تھے، یعنی پاکیزہ فطرت نے ہمیں اپنے رب کی راہ پر ڈال دیا تھا اور دل پکار پکار کر کہتا تھا کہ یہی حق ہے۔ اسی واضح دلیل کی بنا پر ہم کفر و شرک کو غلط قرار دیتے رہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنی جانب سے وحی کے رزق حسن سے بہرہ مند کیا تو فطرت کی آواز اور زیادہ بلند آہنگ ہو گئی۔ وحی کی تعلیم نے اس کو مدلل اور روشن تر کر دیا۔ یہ فطرت کے نور پر وحی کے حقیقی نور کا اضافہ تھا۔

یہی بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی درست ہے۔ آپ کی زندگی فطرت سلیم پر گزری۔ شرک کے مرکز میں رہنے کے باوجود شرک کی پرچھائیں بھی آپ پر نہ پڑیں۔ مکہ کے 'حنفاء' کے بارے میں روایات میں آیا ہے کہ وہ خانہ کعبہ کی دیوار سے لگ کر رب سے یہ دعا کیا کرتے کہ اے رب، ہمیں معلوم نہیں کہ تیری عبادت کیسے کی جاتی ہے، اگر ہمیں اس کی خبر ہوتی تو ہم اسی طریقہ پر تجھے پوجتے۔ حیرانی اور سرگشتگی کی اس کیفیت سے حضور بھی دوچار

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

تھے جس کی تعبیر قرآن نے ان الفاظ سے کی ہے:

مَا کُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْکِتَابُ وَلَا الْاِیْمَانُ. ''تم نہ کتاب کی حقیقت سے واقف تھے اور نہ ایمان کے بارے میں جانتے تھے۔'' (الشوریٰ ۴۲:۵۲)

اس کا سبب یہ ہے کہ دین کا بنیادی تصور درست بھی ہو، لیکن اس کی تفصیلات سے آدمی آگاہ نہ ہو تب بھی وہ متردد سا رہتا ہے کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں معلوم نہیں یہ حقیقت کے مطابق ہے یا نہیں اور اس سے میرا رب راضی ہو رہا ہے یا نہیں۔ اسے اطمینان تب حاصل ہوتا ہے جب وہ راہ بالکل واضح دکھائی دے رہی ہو جس پر اس کو چلنا ہے۔ کتاب آسمانی اس ضرورت کو پورا کرتی ہے کہ وہ مجمل ایمان کے تقاضوں اور مطالبات کو واضح کرتی اور اس کی عملی شکل بتاتی ہے۔ اس کے نزول کے بعد آدمی اپنی فطرت کی رہنمائی کو قابل اعتماد طریقہ سے استعمال کر سکتا اور دینی زندگی اختیار کر سکتا ہے۔ خود نبوت کے منصب کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ نبی دین و شریعت کے فہم میں درجۂ کمال پر فائز ہو۔ ہر حقیقت اس پر اس طرح واضح ہو کہ جیسے وہ اس کو بچشم سر دیکھ رہا ہے۔ جب خود اسے شرح صدر حاصل ہو جاتا ہے تو وہ اپنے مخاطبوں کو پورے یقین و اذعان کے ساتھ تعلیم دینے کے قابل ہوتا ہے۔ جب تک نبی کے اندر ہدایت کی طلب وحی کے ذریعے سے پوری نہیں ہوتی وہ برابر حقیقت کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی ذہنی کیفیت کا تذکرہ قرآن نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ:

وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَہَدٰی. (الضحیٰ ۹۳:۷) ''اس نے تمھیں جویاے راہ پایا تو راستہ دکھایا۔''

تحنث میں دل چسپی

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سرگشتگی کے اس عالم میں دین ابراہیمی کی باقی ماندہ عبادات (نماز، روزہ، طواف، حج اور قربانی وغیرہ) پر عمل کرتے اور اصل حقیقت کو پانے کے لیے برابر غور و فکر کرتے۔ جب اس پر بھی عقدہ نہ کھلا تو آپ کا رجحان بستی سے دور الگ تھلگ رہ کر دھیان و گیان کی جانب ہوا۔ اس کے لیے آپ نے شہر کے ہنگاموں سے ہٹ کر ایک پہاڑ کی چوٹی پر واقع ایک چھوٹے سے غار میں وقت گزارنا اور ابراہیمی طریقہ پر عبادت کرنا شروع کیا۔ اس مقصد کے لیے آپ خورونوش کا سامان لے کر پہاڑ پر چلے جاتے، غار حرا میں بسیرا کرتے اور جب سامان ختم ہو جاتا تو اپنے اہل و عیال میں واپس آ جاتے۔ غار حرا میں آمد و شد کا یہ سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس عبادت کو تحنث کا نام دیا گیا ہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تحنث کی اس عبادت

میں منفرد نہیں تھے، بلکہ دوسرے لوگ بھی جو دین ابراہیمی کی روایات میں دل چسپی رکھتے تھے، وہ بھی اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر تحنث کرتے جو بعض صورتوں میں خاصا طویل ہوتا۔ تحنث کی عبادت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک کو وحی کے حصول کے لیے ساز گار بنانے میں ابتدائی کام کیا اور وہ قلب صافی تیار کیا جو فرشتۂ وحی سے اقتباس نور کے لیے موزوں تھا۔

تحنث کے بارے میں یہ تصور درست نہیں کہ یہ ریاضت، مجاہدہ اور مراقبہ کی قسم کی کوئی چیز ہے جو کاہنوں، جادوگروں اور نجومیوں کی تربیت کا حصہ ہوتی ہے اور جس کی تعلیم انھیں ان کے استاد اور گرو دیتے ہیں۔ یہ لوگ ایک منتخب پیشہ میں مہارت حاصل کرنے کے لیے ایک عمر کھپا دیتے ہیں۔ ان کے اس شوق و تمنا سے ایک عالم آگاہ ہوتا ہے۔ ان سے ملنے جلنے والے انھیں تربیت حاصل کرتے، مجاہدے کرتے اور ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ نبوت و رسالت پانے والوں کا معاملہ مختلف ہوتا ہے۔ اس میں ان کی اکتساب کی کوئی کوشش نہیں ہوتی، کیونکہ نبوت کا منصب اکتسابی ہے ہی نہیں۔ یہ فضل یزدانی ہے۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہے یہ تاج پہنا دے۔ لہٰذا نبی نہ کسی کا شاگرد ہوتا، نہ کسی پیر و مرشد سے مراقبوں اور مجاہدوں کی تربیت حاصل کرتا اور نہ اس کے ذہن ہی میں یہ تصور ہوتا ہے کہ وہ نبوت کے منصب پر فائز ہونے کا اہل ہے۔ پھر یہ تجربہ عام انسانی تجربہ بھی نہیں کہ آدمی دوسروں کو دیکھ کر کوئی رائے قائم کر لے۔ اس کا تجربہ انھی کو ہوا جن کو اللہ تعالیٰ اس عزت سے نوازنا چاہتا تھا۔ اسی لیے نبی کے ابتدائی مشاہدات اس کے لیے بالکل غیر مانوس، انوکھے اور عجیب ہوتے ہیں۔ لہٰذا نبی کی تربیت کا ایک پہلو یہ بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نبوت کے اسرار و رموز کو ان کے لیے مانوس بنانے کے لیے کچھ غیر معمولی حالات سے ان کو دوچار کرے۔

رویاے صالحہ

تحنث کے ذریعے سے صفائی قلب کے مرحلہ سے گزرنے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں جو تبدیلی آئی وہ یہ تھی کہ آپ کو رویاے صالحہ یعنی اچھے اور خوش خبری کی نوید لانے والے خواب نظر آنے لگے۔ یہ ایسے روشن خواب ہوتے جیسے رات کی تاریکی کے اندر سے صبح نمودار ہو جاتی ہے۔ آپ کی طبع مبارک پر اس کا بہت اچھا اثر پڑتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خواب دکھا کر آپ کو آنے والے دنوں کی برکات کے تحمل کے لیے تیار کرنا مقصود تھا تاکہ نبی کا دل و دماغ اور اس کی روح فرشتہ کے ساتھ اتصال اور اقتباس وحی کے لائق ہو جائے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org
www.ghamidi.net

روشنی کی ایک کرن

مستند کتب حدیث کی رو سے ایک مرتبہ، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا میں اپنی معمول کی عبادت میں مصروف اور اللہ سے لو لگائے ہوئے تھے، اچانک ایک فرشتہ نمودار ہوا۔ اس نے آپ کو حکم دیا: 'اقرأ' (پڑھو)۔ آپ نے جواب دیا: 'میں پڑھا ہوا نہیں ہوں'۔ اس پر فرشتہ آپ سے بغل گیر ہو گیا اور اتنے زور سے بھینچا کہ آپ کو تکلیف ہونے لگی۔ پھر اس نے حکم دیا: 'اقرأ' (پڑھو)۔ آپ نے پھر وہی جواب دیا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ فرشتے نے دوبارہ آپ کو سینے سے لگا کر بھینچا جس سے آپ کو بے حد تکلیف ہوئی۔ اس نے چھوڑ کر پھر پڑھنے کو کہا۔ آپ نے پھر وہی جواب دیا۔ فرشتہ نے تیسری مرتبہ سینے سے لگا کر بھینچا اور کہا: 'اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِی خَلَقَ . خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ، اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَم' (پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ انسان کو پیدا کیا خون کی پھٹکی سے۔ پڑھ اور تیرا رب بڑا ہی کریم ہے)۔ یہ کہہ کر فرشتہ غائب ہو گیا۔

اس واقعہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھبرا گئے اور پریشان ہو کر ایسی حالت میں گھر کو چلے کہ آپ کا جسم کانپ رہا تھا۔ نہایت دہشت زدگی کی کیفیت میں آپ نے اپنی زوجۂ محترمہ سے کہا کہ میرے اوپر چادر اوڑھا دو۔ آپ کی طبیعت قدرے سنبھلی تو زوجۂ محترمہ نے اس دہشت زدگی کا سبب پوچھا۔ آپ نے ان کو واقعہ سنایا اور فرمایا کہ مجھے اپنی جان کا خوف ہے۔ انھوں نے آپ کو تسلی دی کہ آپ رشتہ داروں سے جڑتے ہیں، سچ بولتے ہیں، کمزوروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں، غریبوں کی دست گیری کرتے ہیں، حوادث میں لوگوں سے تعاون کرتے ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ کا رب آپ کی جان خطرے میں ڈالے۔ یہ واقعہ ضرور آپ کے لیے خوش خبری لائے گا۔ پھر انھوں نے مشورہ دیا کہ میرے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل ایک بڑے عالم اور نیک آدمی ہیں۔ وہ آسمانی کتابوں کا علم رکھتے ہیں۔ ان کو تمام صورت حال سے آگاہ کیا جائے اور اس واقعہ کی حقیقت معلوم کی جائے۔ آپ نے یہ مشورہ پسند کیا۔ آپ ان کے پاس گئے اور تمام روداد سنائی تو انھوں نے کہا کہ میری رائے میں آپ کے پاس وہی فرشتۂ وحی آیا جس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس بھیجا جاتا تھا۔ پھر کہا: کاش میں توانا ہوتا، کاش میں اس وقت تک زندہ رہوں جب آپ کی قوم آپ کو اس شہر سے نکال دے گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حیران ہو کر پوچھا کہ کیا میری قوم میرے ساتھ ایسا سلوک کرے گی؟ تو ورقہ نے کہا کہ ہاں، جو شخص بھی یہ پیغام لے کر آیا اس کی قوم اس کی دشمن ہو گئی۔

ورقہ بن نوفل کا نام بھی مکہ کے حنفا کے گروہ میں شامل ہے۔ وہ ایک حق پرست آدمی تھے۔ تحقیق و جستجو کے بعد

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

انھیں معلوم ہوا کہ اس وقت اصل دین نصاریٰ کے پاس ہے تو انھوں نے اپنے آبائی مذہب کو خیر باد کہہ کر نصرانیت اختیار کر لی اور اپنے شوق کے باعث عبرانی زبان بھی سیکھی اور تورات کو اس کی اصل زبان میں سمجھنے پر قادر ہو گئے۔ اس بنا پر وہ پیغمبروں کے بارے میں اللہ کی سنت اور ان پیشین گوئیوں سے بھی واقف ہو گئے جو آخری نبی کی بعثت کے بارے میں صحف آسمانی میں موجود تھیں۔ اس دور میں وہ بڑے بوڑھے ہو چکے تھے اور جلد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔

اس مستند روایت سے، جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم، دونوں میں معمولی تغیر الفاظ کے ساتھ موجود ہے، چند نتائج اخذ ہوتے ہیں:

۱۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود یہ بیان نہیں کرتے کہ میرے پاس غار حرا میں ایک فرشتہ آیا۔ یہ بیان راوی کا ہے کہ آپ کے پاس فرشتہ آیا۔ فرشتے نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا تعارف نہیں کرایا۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جستجو ہوئی کہ کسی صاحب علم سے رائے لی جائے کہ یہ معاملہ کیا تھا۔ ورقہ بن نوفل نے احوال معلوم کر کے اندازہ لگایا کہ یہ فرشتۂ وحی ہو سکتا ہے۔

۲۔ یہ جان لینے کے باوجود کہ علامات فرشتۂ وحی کی آمد کی ہیں، ورقہ بن نوفل نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ نہیں کہا کہ آپ اللہ کے رسول مقرر ہوئے ہیں۔ یعنی اس مرحلہ پر انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی یا رسول تسلیم نہیں کیا۔

۳۔ ورقہ بن نوفل کا ماضی گواہ ہے کہ وہ ایک حق پرست آدمی تھے۔ حقیقت کی تلاش ہی میں انھوں نے نصرانیت اختیار کی تھی۔ ان پر اگر یہ بات واضح ہوتی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں تو کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ آپ پر ایمان لا کر ایمان میں سبقت کا اعزاز حاصل نہ کرتے، جبکہ وہ حسرت کا اظہار کرتے رہے کہ میں ناتوان ہو چکا ہوں، اس کے باوجود اگر میں زندہ رہا تو آپ کی نصرت کرنے میں پیش پیش رہوں گا۔ گویا غار کے واقعہ میں انھوں نے اس بات کے آثار دیکھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آیندہ کسی وقت منصب رسالت سے سرفراز ہو سکتے ہیں۔

۴۔ فرشتے کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ صرف اتنا تھا کہ 'اقرأ'۔ یہ لفظ اپنے طور پر پڑھنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور دوسروں کے سامنے پڑھ کر سنانے کے لیے بھی۔ قرآن میں یہ دوسرے مفہوم میں بکثرت آیا ہے۔ اس صورت میں 'اقرأ' کا صحیح مفہوم ہو گا کہ لوگوں کو پڑھ کر سناؤ۔ یہ گویا نبی کی ذمہ داری کا بیان ہے کہ جو پیغام آپ کو دیا جائے گا، اسے لوگوں تک پہنچانا ہو گا۔

۵۔ فرشتے نے پڑھ کر سنانے کا حکم تو دیا، لیکن یہ نہیں بتایا کہ کیا پڑھنا یا کیا سنانا ہے۔ اس وضاحت کو تشنہ چھوڑ کر

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

وہ غائب ہوگیا، حالاں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم برابر یہ کہتے رہے کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ میں کیا سنا سکتا ہوں۔ دوسرے الفاظ میں سنانے کے لیے کوئی پیغام نہیں دیا گیا۔ اس کے برعکس قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور کے پاس جب ایک درخت پر تجلی دیکھی اور اس کے قریب گئے تو پہلی وحی ہی سے ان کو معلوم ہو گیا کہ وہ منصب رسالت پر فائز کیے گئے ہیں اور انھوں نے توحید و آخرت کے بارے میں لوگوں کے عقائد کو درست کرنا اور ان کے اندر نماز کو رائج کرنا ہے۔ انھیں کسی تحقیق کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

۶۔ فرشتے نے تین بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سینے سے لگا کر بھینچا۔ اس عمل کا مقصد اگر یہ تھا کہ آپ کا سینہ کھل جائے اور پڑھنا آ جائے تو یہ مقصد حاصل نہیں ہوا۔ بعد کی زندگی میں بھی آپ لکھنے پڑھنے پر قادر نہیں ہوئے۔ لہٰذا فرشتے کے بھینچنے کا مقصد کچھ اور متعین کرنا پڑے گا۔

۷۔ کتب حدیث و سیرت میں یہ شہادت نہیں ملتی کہ واقعۂ حرا کے فوراً بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دین اسلام کی تبلیغ شروع کر دی ہو۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اس وقت خود آپ پر اپنی حیثیت واضح نہ تھی اور نہ ہی کوئی پیغام تھا جسے لوگوں کو سنانا تھا۔

ان نکات کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ واقعۂ حرا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو تجربہ ہوا، یہ بھی آپ کی تربیت ہی کا حصہ تھا۔ فرشتۂ وحی کی شخصیت سے تعارف اس کا اصل مقصد تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ پیغام دینا مقصود تھا کہ یہ فرشتہ آیندہ آپ کے پاس آنے والا ہے۔ یہ رب کے پیغام آپ تک پہنچائے گا اور آپ کی ذمہ داری یہ ہوگی کہ ان کو لوگوں تک پہنچائیں۔ لہٰذا یہ بات صحیح نہیں کہ واقعۂ حرا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا نقطۂ آغاز تھا اور اس میں پہلی وحی نازل ہوئی تھی۔

جہاں تک فرشتے کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بار بار مخاطب کرنے اور بھینچنے کا تعلق ہے اس کی توجیہ مولانا امین احسن اصلاحی یوں کرتے ہیں:

> ''(ایک انسان کے لیے) کسی روحانی طاقت سے اتصال کا موقع بڑا نازک ہوتا ہے۔ اس کے لیے ذہن اور دماغ کو تیار کرنے کے لیے بار بار کی ملاقات، بار بار کی آشنائی اور بار بار کا انس ضروری ہوتا ہے... فرشتے کا بار بار بھینچنے اور چھوڑنے کا مطلب پوری طرح سے اپنے آپ کو پہچنوا دینا، بے تکلف کر دینا اور اپنی ذات اور آواز سے پیغمبر کو آشنا کر دینا ہو سکتا ہے تاکہ جب دوبارہ ملاقات ہو تو آپ کو اطمینان ہو جائے کہ وہی یار غار آ گیا ہے۔ یہ کوئی شیطانی چیز نہیں۔'' (امین احسن اصلاحی۔ تدبر حدیث۔ شرح صحیح بخاری ۲۸/۱، ادارۂ تدبر قرآن و حدیث لاہور، ۲۰۰۲)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

مطلب یہ ہوا کہ اس عمل کا مقصد فرشتۂ وحی سے محض تعارف تھا اور اصل وحی کا نزول یا دوسرے الفاظ میں منصب رسالت پر فائز کرنے کا معاملہ آیندہ کی کسی ملاقات پر چھوڑ دیا گیا۔

روایات سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ اس کے بعد ایک مدت تک فرشتہ کی آمد نہیں ہوئی۔ اس عرصہ کو فترۃ الوحی یا وحی کے انقطاع کا نام دیا جاتا ہے جو ہمارے نزدیک صحیح نہیں۔ جب پہلی مرتبہ وحی نازل ہی نہیں ہوئی تو اس میں انقطاع کیسے ہوسکتا ہے۔ حقیقت میں وحی کا نقطۂ آغاز فرشتۂ وحی کی آمد ثانی کا موقع ہے جس میں کچھ عرصہ لگا۔

واقعۂ حرا کو جو پہلی وحی کے نزول کا موقع ٹھہرایا جاتا ہے تو اس کی وجہ سورۂ علق کی ابتدائی آیات ہیں جو روایت کی رو سے، فرشتہ نے تیسری مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھینچنے کے بعد پڑھیں۔ اس پر بھی چند سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کا تشفی بخش جواب نہیں ملتا۔ مثلاً:

۱۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر پہلی وحی پہنچائی جا چکی تھی تو آپ کے اوپر اپنے رسول ہونے کا معاملہ مشتبہ کیوں رہ گیا کہ آپ کو ورقہ بن نوفل کے پاس جا کر پوچھنا پڑا کہ میرے ساتھ یہ کیا معاملہ ہوا ہے۔ آپ کو تو پورے یقین و اذعان کے ساتھ کہنا چاہیے تھا کہ میرے اوپر وحی ان الفاظ میں نازل ہوئی اور مجھے اس کو پڑھ کر سنانے کا حکم ہوا ہے۔ لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا۔

۲۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر پہلی وحی نازل ہوئی تو دین کے بنیادی امور آپ کو بتا دیے گئے اور ذمہ داری کی نوعیت کے لحاظ سے ہدایات دے دی گئیں۔ اس کے برعکس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر سورۂ علق کی ابتدائی آیات دی گئیں تو ان میں یہ ہدایت تو ضرور ہے کہ پڑھ کر سنائیں، لیکن پیغام کوئی نہیں ہے۔ محض اللہ تعالیٰ کی چند صفات ان آیات سے اخذ کی جاسکتی ہیں۔

۳۔ سورۂ علق کی آیات کے پہلی وحی ہونے کو امت نے بالاتفاق تسلیم نہیں کیا۔ صحیح مسلم میں یحییٰ سے روایت نقل ہوئی ہے کہ میں نے ابوسلمہ سے سوال کیا کہ قرآن کا کون سا حصہ پہلے نازل ہوا۔ انھوں نے کہا: 'یایھا المدثر'۔ میں نے کہا: 'اقرأ' سب سے پہلے نازل نہیں ہوئی؟ انھوں نے جواب دیا کہ میں نے یہی سوال جابر بن عبداللہ سے کیا تھا تو ان کا جواب تھا: 'یایھا المدثر'۔ جب میں نے پوچھا کہ 'اقرأ' پہلے نازل نہیں ہوئی تو انھوں نے جواب دیا کہ میں وہ کچھ بیان کر رہا ہوں جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا۔

(صحیح مسلم، باب بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۸۰)

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ تابعین کے زمانہ ہی میں یہ اختلاف سامنے آ گیا تھا، بعض لوگ 'اقرأ' کو اولین

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

وحی قرار دیتے تھے اور دوسرے لوگ رسول اللہ کے حوالہ سے 'یاایھا المدثر' کو پہلی وحی مانتے تھے۔ دیکھا جائے تو مدثر کی ابتدائی آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض احکام دیے گئے ہیں اور تبلیغ کا حکم دیا گیا ہے، جبکہ اقرا کی آیات میں یہ بات نہیں۔

ان نکات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ ابتدائے وحی کی روایت کا آخری حصہ، جس میں سورۂ علق کی آیات نقل کی گئی ہیں، کچھ قابل اعتماد نہیں ہے۔ اس بارے میں مولانا امین احسن اصلاحی کی رائے بڑی اہم اور دل کو بھاتی ہے۔ وہ اس کی توجیہ یوں کرتے ہیں:

> ''رب کے نام سے پڑھ کر سنانے کی ہدایت میں ایک اہم نکتہ پوشیدہ ہے۔ وہ یہ کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق قدیم صحیفوں میں جو پیشین گوئی کی گئی ہے، اس کا خاص پہلو یہ ہے کہ آخری نبی جب آئے گا تو اپنے رب کے نام سے سنائے گا...(یہاں مولانا نے کتاب استثناء (۸:۱۸۔۱۹) کی عبارت نقل کی ہے جو مذکورہ پیشین گوئی پر مشتمل ہے)...اگر فرشتے کا جواب 'اقرأ باسم ربك' تک محدود مانا جائے تو یہ مذکورہ پیشین گوئی کے پورا ہونے کی خبر ہے۔ اس صورت میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا بھی ٹھیک ہے کہ میں تو جانتا نہیں کہ مجھے لوگوں کو کیا سنانا ہے اور فرشتے کا یہ بتانا بھی معنی خیز ہے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کے نام سے سنانا ہے۔ وہی آپ کو بتائے گا کہ آپ کیا سنائیں۔ میرے خیال میں فرشتے کا جواب 'اقرأ باسم ربك' تک ہی تھا اور اس کا مقصد پیغمبر کو خدا کا کلام خلق کو سنانے کے لیے تیار کرنا تھا۔'' (امین احسن اصلاحی، تدبر حدیث، شرح صحیح بخاری ۲۹/۱)

حضور کی گھبراہٹ

ایک سوال اس واقعہ سے یہ پیدا ہوتا ہے کہ پہلی مرتبہ فرشتہ کا سامنا ہونے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر گھبراہٹ کیوں طاری ہو گئی کہ آپ کو تحنث چھوڑ کر انتہائی سراسیمگی اور خوف زدگی کے عالم میں گھر جانا پڑا اور حواس بحال ہونے کے بعد آپ اس قابل ہوئے کہ زوجۂ محترمہ کو تمام احوال کی خبر دے سکیں۔ ہمارے نزدیک اس کا سبب یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بغیر کسی آرزو اور منصوبہ بندی کے خالی الذہن ہو کر عبادت میں مصروف تھے۔ یہ موہبت ربانی یکایک ہوئی جس کی توقع آپ کو پہلے سے نہیں تھی۔ لہٰذا اس نامانوس اور انوکھے تجربہ سے آپ گھبرا گئے۔ فوری طور پر اس کا مقصد بھی آپ کو نہیں بتایا گیا اور نہ اس کے اسرار و رموز پر آپ مطلع ہو سکے۔

یہاں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ابھی تربیت کے مرحلہ سے گزر رہے تھے۔ اس کے برعکس حضرت موسیٰ علیہ السلام کو معلوم ہو چکا تھا کہ آپ رسول مبعوث کیے جا چکے ہیں۔ آپ کو ہدایات تک بھی دے دی گئیں۔ لیکن جب عصا کا

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

معجزہ عنایت کیا گیا تو وہ گھبرا کر موقع سے دوڑ پڑے اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ ان کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ ان کی لاٹھی حقیقی سانپ کی صورت اختیار کر لے گی۔ چنانچہ ان کو تسلی دی گئی کہ میرے ہاں اللہ کے رسول خوف زدہ نہیں ہوا کرتے۔

رسول کی یہ کیفیت بالکل عارضی ہوتی ہے۔ جب وہ وحی کے تجربات سے بار بار گزرتا ہے تو اس کو پوری طرح شرح صدر حاصل ہو جاتا ہے کہ جو مشاہدے اس کو ہو رہے ہیں، یہ من جانب اللہ ہیں اور وہ ایک خاص فریضہ ادا کرنے پر مامور کیا جا رہا ہے۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

محمد وسیم اختر مفتی

عمر فاروق رضی اللہ عنہ

[''سیر وسوانح'' کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

——— ۵ ———

جنگ قادسیہ کے بعد ایرانی فرار ہو کر بابل اور ایران کے مختلف اطراف میں بکھر گئے۔ مسلمان دو ماہ وہیں مقیم رہے، انھوں نے اپنی تکان اتاری اور حضرت سعد بن ابی وقاص نے عرق النسا (sciatica) سے افاقہ پایا۔ تب خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق نے انھیں حکم دیا کہ بچوں اور عورتوں کو عتیق میں چھوڑ کر مدائن کو کوچ کریں۔ حضرت سعد نے زہرہ بن حویّہ کو مقدمہ کے طور پر آگے بھیجا، وہ حیرہ سے ہوتے ہوئے مدائن کو چلے۔ بُرس (بیرنمرود) کے مقام پر انھوں نے ایک ایرانی دستے کو شکست دی، بابل کی راہ پر فیرزان کی فوج کو ہزیمت سے دوچار کیا۔ کوثی کے مقام پر شہریار نے ان کی فوج کو للکارا۔ یہ وہی مقام ہے جہاں نمرود نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قید کیا تھا، وہ قید خانہ ابھی موجود تھا۔ مقابلہ شروع ہوا تو زہرہ نے بنو تمیم کے نائل بن جعشم کو بھیجا۔ شہریار انھیں گرا کر ان کے سینے پر سوار ہو گیا، اس کا انگوٹھا ان کے دانتوں تلے آ گیا، انھوں نے اسے ہی چبا ڈالا۔ اب شہریار نیچے تھا اور نائل اوپر، انھوں نے خنجر نکالا اور اس کا پیٹ چاک کر دیا۔ شہریار کی فوج بھاگ نکلی، حضرت سعد پہنچے تو شہریار کا قیمتی لباس اور ہتھیار نائل کے حوالے کیے۔ وہ کچھ دیر کے لیے بابل میں ٹھہر گئے، زہرہ اور ہاشم بن عتبہ نے مدائن کا رخ کیا۔ راستے میں سابقہ ملکۂ ایران

بوران بنت کسریٰ کے دستے سے ان کی مڈبھیڑ ہوئی۔اس میں شامل ایرانی روزانہ حلف اٹھاتے تھے کہ جب تک زندگی ہے ملک ایران پر زوال نہ آنے دیں گے۔خسرو کا پالتو شیر بھی ان کے ساتھ تھا، ہاشم نے لپک کر وار کیا اور تلوار سے شیر کا کام تمام کر دیا۔اس دستے نے بھاگ کر بہرہ شیر (بہرسیر) میں پناہ لی۔زہرہ ساباط پہنچے تو وہاں کے باشندوں نے جزیہ ادا کرنے کی شرط پر صلح کر لی۔حضرت سعد کے دستوں نے دجلہ وفرات کے مابین کارروائیاں کر کے ایک لاکھ دہقانوں کو قیدی بنا لیا تھا اور ان کے گرد خندقیں کھود دی تھیں۔ان کے سردار شیرزاد نے جزیہ وخراج دینے کی پیش کش کر کے امن کی درخواست کی جو حضرت سعد نے مان لی، عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے فیصلے کو برقرار رکھا۔اب عرب کی سرحدوں سے لے کر دارالخلافہ مدائن تک تمام ایران خلافت اسلامی کے زیرنگیں ہو چکا تھا، اس لیے انھیں عقب سے حملے کا اندیشہ نہ رہا۔

بابل کے بعد تعمیر ہونے والا ایرانی دارالخلافہ مدائن شان وشوکت میں اس قدیم شہر پر فوقیت رکھتا تھا، دجلہ اسے اس کے جڑواں شہر بہرہ شیر (بہرسیر) سے جدا کرتا تھا۔مدائن کا قدیم یونانی نام طیسفون تھا اور بہرہ شیر سلوقیہ کہلاتا تھا۔یزدگرد کے اجداد نے ان شہروں پر قبضہ کر کے ان کے نام بدل ڈالے تھے۔بغداد ان دونوں سے ۳۰ کلومیٹر دور شمال میں تھا۔پیش تر اس کے کہ وہاں کے باشندے دفاع کی کوئی تدبیر کرتے، امیر جیش اسلامی حضرت سعد بن ابی وقاص نے ان شہروں پر جلد حملے کا فیصلہ کر لیا۔وہ فوج لے کر بہرہ شیر پہنچے تو وہاں کے لوگ شہر بند ہو چکے تھے۔انھوں نے منجنیقوں سے سنگ باری کی، لیکن شہر کی مضبوط فصیل پر کوئی اثر نہ ہوا۔بہرسیر دجلہ پر بنے ہوئے ایک پل کے ذریعے سے مدائن سے متصل تھا، وہاں سے غذائی اور فوجی امداد کی آمد کا سلسلہ برابر جاری تھا۔اس لیے محاصرہ طول پکڑتا گیا، ۹ ماہ یا ا سال کے اس طویل عرصے میں وقتاً فوقتاً ایرانی جتھے شہر سے باہر نکل کر مسلمانوں پر حملہ کرتے، لیکن مار کھا کر لوٹتے۔مسلمانوں کی ثابت قدمی دیکھ کر ایرانیوں کا صبر جواب دے گیا۔انھیں یقین ہو گیا کہ وہ ان کو مغلوب نہ کر سکیں گے۔تب شاہ یزدگرد نے حضرت سعد کو پیغام بھیجا کہ دجلہ کو عرب وعجم کے مابین حد فاصل بنا لیا جائے، دریا کے ادھر والا علاقہ مسلمان لے لیں اور اس طرف کا ایرانیوں کے لیے چھوڑ دیں۔اس صورت حال میں جبکہ مدائن سامنے تھا اور ایرانیوں کے پاؤں اکھڑ چکے تھے، صلح کا موقع نہ رہا تھا۔اس لیے حضرت سعد نے انکار کا پیغام دے کر ایک ایلچی روانہ کر دیا اور فوراً بہرہ شیر (بہرسیر) کا محاصرہ تنگ کر کے اس پر سنگ برسانے کا حکم دیا۔ادھر سے نیزہ چلا نہ تیر تو فصیل پھلانگ کر شہر کا دروازہ کھولا گیا۔شہر میں ایک آدمی کے سوا کوئی نہ تھا، ایرانیوں نے جاتے جاتے دجلہ کا معبر جلا دیا اور کشتیوں کو دریا کے اس پار منتقل کر دیا تھا۔اب پرشور موجیں مارتا ہوا دریاے دجلہ اسلامی فوج کی پیش قدمی کو

روکے ہوئے تھا۔اس کے دوسری طرف کسریٰ کا سفید محل (قصر ابیض) چمک رہا تھا،اسے نوشیرواں نے ۵۵۰ء میں تعمیر کیا تھا۔ یزدگرد نے مدائن والا کنارہ مضبوط بنا کر مسلمان فوج کی آمد مستقلاً روکنے کی تدبیریں سوچیں،لیکن کوئی راہ نہ پا کر فرار ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ اس نے اپنے خزانے سمیٹے،اہل وعیال اور غلاموں باندیوں کا قافلہ تیار کیا اور حلوان کو روانہ ہو گیا۔اب اس پار عزم و ہمت سے محروم ایک قوم تھی جس کا قائد اسے چھوڑ چکا تھا،اسے کامیابی کی کوئی توقع نہ تھی۔ادھر ایمان ویقین سے پر مسلمان فتح کے لیے بے تاب تھے۔

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ دجلہ کے کنارے کھڑے اسے عبور کرنے کی فکر میں تھے۔انھیں ایک ہی ترکیب سوجھی کہ کچھ لوگ دریا پار کر کے دوسرے کنارے تک پہنچیں اور پھر وہ وہاں کھڑے ہوئے ایرانیوں کو ہٹا کر باقی لشکر کو دریا پار کرانے میں مدد دیں۔ ان کی تجویز پر سب سے پہلے عاصم بن عمرو رضی اللہ عنہ نے لبیک کہا،پھر مزید ۶۰۰ رضا کار آگے آ گئے۔ان میں سے ۶۰ گھڑ سوار سبقت کرنے کو تیار ہو گئے، پہلے ان کے قائد حضرت عاصم نے اپنا گھوڑا دریا میں ڈالا پھر باقی سب پانی میں کود پڑے۔ یہ ''خطروں میں کودنے والا دستہ'' دجلہ کے وسط میں پہنچا تو حضرت قعقاع بن عمرو کی سرکردگی میں باقی شہ سواروں نے دریا میں چھلانگیں لگا دیں،اسے ''خاموش دستے'' کا نام دیا گیا۔دوسرے کنارے پر کھڑے ایرانی پکار اٹھے، یہ دیوانے ہیں یا جن؟ پھر انھوں نے مسلمانوں کو روکنے کے لیے تیر اندازی شروع کر دی۔ حضرت عاصم نے بھی اپنے ساتھیوں کو تیر برسانے کا حکم دیا۔ان کے تیروں سے کئی ایرانی گھوڑوں کی آنکھیں پھوٹ گئیں تو وہ اپنے سواروں کو دجلہ میں گراتے ہوئے واپس دوڑے۔ حضرت عاصم کا دستہ کنارے پر پہنچا تو تمام ایرانی بھاگ لیے اور جب حضرت قعقاع اور ان کے ساتھی پار اترے تو دریا کا کنارہ خالی تھا۔اب حضرت سعد نے تمام سواروں کو دریا میں کودنے کا حکم دیا۔ دجلہ اسلامی لشکر سے بھر گیا،اس وقت پانی نہیں، ہر طرف گھوڑوں اور گھڑ سواروں کے سر نظر آتے تھے۔ پار سے کشتیاں لا کر پیادوں اور ساز و سامان کو منتقل کیا گیا۔ یوں دجلہ سیل اسلامی کی ایک موج اور ''بحر ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے'' عہد فاروقی کے اس اہم واقعے کی تلمیح بن گیا۔اس سارے معرکے میں محض بنو طے کا ایک شخص شہید ہوا، دجلہ عبور کرتے ہوئے ایک مسلمان کا لکڑی کا پیالہ دریا میں گر گیا،اسے بھی پکڑ لیا گیا۔اگر ۱۴ویں صدی عیسوی میں تیمور لنگ نے اسی طرح دجلہ عبور نہ کیا ہوتا تو شاید مستشرقین کو یہ واقعہ ماننے میں بھی تامل ہوتا۔

تمام اہل مدائن فرار ہو چکے تھے،قلعہ بندوں نے جزیہ مانا اور قصر ابیض مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔ قائد جیش اسلامی حضرت سعد نے ساسانیوں کے اس محل میں داخل ہو کر شکرانے کے نفل ادا کیے، بعد ازاں انھوں نے شاہی ایوان

کو مسجد میں تبدیل کر دیا۔ اس محل میں ۳۰ کھرب دینار کا خزانہ، تحائف اور آرایش و زیبایش کا سامان تھا۔ حضرت سعد نے یزدگرد کو پکڑنے کے لیے ایک فوجی رسالہ روانہ کیا، بادشاہ تو ان کے ہاتھ نہ آیا، البتہ وہ قافلے کے کچھ افراد اور شاہی خزانہ لے آئے، خسروی تاج اور خلعتیں بھی ان کے ہاتھ لگیں۔ اس طرح کے مواقع پر فاتح لشکر کے سپاہی لوٹ مار کرتے ہیں اور اپنی جیبیں خوب بھرتے ہیں، دنیا کو حیرت ہوگی کہ ایسا ایک واقعہ بھی پیش نہ آیا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص کو کہنا پڑا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کی فوقیت کا فیصلہ نہ فرمایا ہوتا تو میں کہتا کہ یہ فوجی بھی بدریوں جیسی فضیلت رکھتے ہیں۔ جنگ ردہ میں مرتدین کی سربراہی اور پھر ارتداد سے توبہ کرنے والے طلیحہ، عمرو بن معدی کرب اور قیس بن مکشوح اس معرکے میں بھی شریک تھے۔ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے ان کے بارے میں گواہی دی، میں نے ان جیسا امانت دار نہیں دیکھا۔ حضرت سلیمان باہلی مال غنیمت کی تقسیم پر مامور تھے۔ مال غنیمت کا ۴/۵ واں حصہ فوجیوں میں تقسیم کیا گیا۔ ۶۰ ہزار گھڑ سواروں نے اس جہاد میں حصہ لیا تھا، ہر ایک کے حصے ۱۵ ہزار دینار آئے۔ حضرت سعد نے مدائن کے خالی گھر بھی فوجیوں میں بانٹ دیے، ان میں سے کچھ نے اپنے بال بچے حیرہ اور دوسرے شہروں سے لا کر ان گھروں میں بسا دیے۔ خمس الگ کرتے ہوئے حضرت سعد نے اہل لشکر کی اجازت سے وہ بیش قیمت ریشمی شاہی قالین بھی اس میں شامل کر دیا جس پر سونے، موتیوں اور جواہرات سے ایران کا نقشہ بنا ہوا تھا۔ بشیر بن خصاصیہ اس مال کو لے کر مدینہ پہنچے۔ سیدنا عمر نے حضرت سراقہ بن مالک کو بلا کر کسریٰ کا لباس، تاج اور کنگن سونپے۔ یوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ پیشین گوئی سچ ثابت ہوئی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت مدینہ کے وقت فرمائی تھی۔ پھر حضرت عمر نے ہاتھ بلند کیے اور دعا کی: اے اللہ، تو نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ نعمتیں نہیں دیں، حالانکہ وہ تمھیں زیادہ محبوب تھے اور تو نے ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کو بھی ان سے محروم رکھا، حالانکہ وہ تمھیں مجھ سے زیادہ پیارے تھے۔ میں تیری پناہ مانگتا ہوں کہ تو نے یہ سب مجھے آزمانے کے لیے دیا ہو۔ پھر وہ اتنا روئے کہ ان کے پاس موجود ہر شخص کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ انھوں نے حضرت عبدالرحمان بن عوف کی ذمہ داری لگائی کہ شام ہونے سے پہلے پہلے ان کے حصے کا مال تقسیم کر دیا جائے۔ پھر انھوں نے خمس اہل مدینہ میں تقسیم کیا، ہر ایک کا حصہ اس کے مقام و مرتبے کے مطابق متعین کیا گیا، جو لوگ موجود نہ تھے، ان کا حصہ الگ کر دیا گیا۔ اب حضرت عمر فاروق نے قالین کے بارے میں صحابۂ کرام کی رائے لی، اس موقع پر حضرت علی نے خوب حق نصیحت ادا کیا۔ انھوں نے کہا کہ اگر آپ نے قالین کو اسی شکل میں برقرار رکھا تو کل کلاں کوئی شخص استحقاق کے بغیر ہی اس کا مالک بن بیٹھے گا۔ حضرت عمر کی دنیا سے بے رغبتی دیکھیے، اس مشورے سے بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے فی الفور اس قیمتی قالین

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

کے کئی ٹکڑے کر کے لوگوں میں بانٹ دیے۔ قالین کی قیمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ علی رضی اللہ عنہ کے حصے میں آیا ہوا معمولی ٹکڑا ۲۰ ہزار دینار میں بکا۔

ادھر ایوان کسریٰ میں اذان و اقامت کی آوازیں بلند ہوتیں، حضرت سعد امامت کراتے اور لوگوں کو وعظ کہتے۔ انھوں نے ایرانیوں سے مزید جنگ کرنے کی کوئی پلاننگ نہ کی، کیونکہ خلیفۂ ثانی کی طرف سے ایسا کوئی حکم نہ ملا تھا، البتہ وہ اپنے جاسوسوں کے ذریعے سے ایران کی بھگوڑی قوت مقتدرہ کی کھوج میں رہتے۔ انھیں معلوم ہوا کہ یزدگرد حلوان جا رہا تھا کہ ایران کے اطراف و اکناف سے بے شمار فوجی اور جنگ جو اس کے ساتھ آ ملے ہیں۔ اس نے مہران کو ان کا کمانڈر مقرر کر کے اس نئی فوج کو مدائن سے ۶۵ کلومیٹر دور جلولا کے قلعہ نما شہر میں بھیج دیا ہے۔ قادسیہ میں مسلمانوں کے ہاتھ ہلاک ہونے والے ایرانی جرنیل رستم کا بھائی خرزاد بن فرخ زاد بھی وہاں جنگی تیاریوں میں مشغول ہے۔ اس نے جلولا کے گرد خندق کھدوا کر اس کے گرد لوہے کی خاردار تار نصب کروا دی ہے اور شہر کو آنے والے تمام راستوں پر کانٹے (گوکھرو یا بھکھڑے کے خار) بچھوا دیے ہیں۔ ہر طرح کے ہتھیار اور کیل کانٹے سے لیس ایک نیا لشکر تیار ہوا چاہتا ہے۔ ایرانی اس فوجی اجتماع سے بڑی توقعات وابستہ کیے ہوئے ہیں۔ حضرت سعد بن ابی وقاص نے حضرت عمر فاروق سے ہدایات مانگیں۔ انھوں نے حکم ارسال کیا کہ ہاشم بن عتبہ ۱۲ ہزار فوج لے کر جلولا روانہ ہو جائیں اور قعقاع بن عمرو کو مقدمہ پر مقرر کیا جائے۔ خلیفۂ ثانی نے میمنہ و میسرہ پر دو بھائیوں حضرت سعد بن مالک اور حضرت عمر بن مالک اور ساقہ پر حضرت عمرو بن مرہ جہنی کی تقرریاں بھی کیں۔ یہ صفر ۱۷ھ کا واقعہ ہے۔ ہاشم چوتھے روز جلولا پہنچے تو ایرانیوں کو قلعہ بند پایا۔ انھیں حلوان سے جبکہ مسلمانوں کو مدائن سے کمک پہنچ رہی تھی۔ محاصرہ شروع ہوا تو اڑھائی ماہ جاری رہا۔ اس دوران میں ایرانی قلعہ سے نکل کر مسلمان محاصرین پر حملہ بھی کرتے، لیکن شکست کھا کر لوٹتے۔ تنگ آ کر ایک صبح مہران نے اسلامی فوج پر حملہ کر دیا۔ تیروں، تلواروں، نیزوں اور کلہاڑوں سے ہونے والی یہ جنگ عصر تک کسی نتیجے پر پہنچتی نظر نہ آتی تھی۔ نماز قصر ادا کرنے کے بعد حضرت قعقاع نے سپاہیوں کو یک جان ہو کر ایک فیصلہ کن حملہ کرنے کا حکم دیا۔ ان کی کمان میں اسلامی فوج نے خندق تک یلغار کر لی تھی کہ اندھیری رات ہو گئی، سپاہی جنگ اگلے دن کے لیے موقوف کرنا چاہتے تھے۔ حضرت قعقاع نے حملہ جاری رکھنے کو کہا۔ سخت لڑائی شروع ہوئی تو ایرانی گاجر مولی کی طرح کٹنے لگے۔ اس ایک رات میں ایک لاکھ ایرانی کھیت رہے، باقیوں نے حلوان کو راہ فرار اختیار کی جہاں ایران کا شکست خوردہ بادشاہ یزدگرد مقیم تھا۔ حضرت قعقاع نے ان کا پیچھا کیا، مہران مارا گیا جبکہ فیرزان جان بچا کر یزدگرد تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ حلوان پہنچے تو معلوم ہوا کہ یزدگرد

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

وہاں سے بھی فرار ہو کر رے جا چکا ہے، جاتے ہوئے اس نے خسرو شنوم کی کمان میں ایک فوج وہاں متعین کر دی ہے۔شنوم نے شہر سے نکل کر حضرت قعقاع کا مقابلہ کیا، مگر اسے شکست کھانی پڑی، اس طرح حضرت قعقاع نے حلوان پر قبضہ کر لیا۔

حضرت سعد بن ابی وقاص نے جلولا اور حلوان کی فتح کی خوش خبری دے کر زیاد کو مدینہ روانہ کیا، مال غنیمت کا خمس ان کے ساتھ تھا۔انھوں نے امیرالمومنین سے ملک ایران میں مزید پیش قدمی کرنے کی اجازت بھی مانگی۔زیاد شام کے وقت مدینہ پہنچے۔ فاروق اعظم بہت خوش ہوئے،انھوں نے صحابۂ کرام کو جمع کر کے تمام واقعات تفصیل سے سنے۔پھر مال غنیمت کی نگرانی وحفاظت کرنے کا انتظام کیا اور حکم دیا کہ یہ انبار صحن مسجد میں اسی طرح موجود رہے۔اگلے دن فجر کے بعد انھوں نے تمام مال واسباب لوگوں میں تقسیم کیا۔ جواہرات کے ڈھیر اور کثرت سے موجود بیش قیمت مال غنیمت دیکھ کر سیدنا عمر رو پڑے۔حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے کہا کہ امیرالمومنین، یہ تو مقام شکر ہے، آپ رو رہے ہیں؟ان کا جواب تھا: اللہ تعالیٰ جس قوم کو دنیا کی دولت عطا فرماتا ہے،اس میں رشک وحسد پیدا ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں تفرقہ پڑ جاتا ہے۔مجھ کو اسی تصور نے رلا دیا۔انھوں نے حضرت سعد کے خط کا جواب بھی ارسال کیا کہ مسلمانوں نے ایران وعراق میں پیہم صعوبتیں برداشت کی ہیں۔ابھی چند روز اپنے لشکر کو آرام کرنے کا موقع دو۔

ادھر اسلامی افواج کے کمانڈران چیف حضرت ابوعبیدہ بن جراح ذوالکلاع میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے،ان کی منزل حمص (امیسا) تھی۔حمص شام کا ایک شہر اور ضلع ہے۔یہاں سورج کا مندر تھا جہاں دور دور سے بت پرست پوجا کرنے آتے۔حمص، انطاکیہ اور بیت المقدس ہی چند بڑے اور مرکزی مقامات رہ گئے تھے۔ جہاں شرک کی حکمرانی تھی۔حضرت ابوعبیدہ ابھی ذوالکلاع میں تھے کہ قیصر روم ہرقل نے قوذر بطریق (آتش پرستوں کا پجاری) کو ان کا راستہ روکنے بھیجا۔اس کی فوج حمص سے چل کر مرج روم پہنچی تھی کہ قیصر نے اس کی کمک کے لیے شمس بطریق کا دستہ روانہ کیا۔ دونوں بطریقوں (پجاریوں) کی فوج اسلامی فوج سے آ ٹکرائی۔شمس بطریق حضرت ابوعبیدہ کے ہاتھوں مارا گیا اور رومی پیٹھ پھیر کر واپس حمص بھاگے۔قیصر اپنی فوج کی ہزیمت دیکھ کر الرابا کو کوچ کر گیا۔اب حضرت ابوعبیدہ بن جراح مرج روم سے اپنی فوج لے کر حمص آئے،انھوں نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ ہرقل نے بہت کوشش کی کہ باہر رہ کر اہل حمص کو مدد پہنچائے،لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی۔آخر کار اہل حمص مجبور ہو گئے کہ مسلمانوں سے انھی شرائط پر صلح کر لیں جو دمشق والوں نے اپنا شہر مسلمانوں کے حوالے کرتے ہوئے مانی تھیں۔حمص زیر ہوا تو حمص اور قنسرین کے درمیان واقع ایک شہر حمات (حماۃ) پر حملہ کیا گیا، وہاں کے سکان نے بھی جزیہ دینے کی شرط مان کر صلح

کر لی۔ اب شیرز اور معرہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا۔ لاذقیہ کے رہنے والے عیسائیوں نے مسلمانوں کا مقابلہ کیا، مگر وہ بھی مغلوب و مفتوح ہوئے پھر سلمیہ مسلمانوں کے قبضے میں آیا۔ اس موقع پر حضرت ابوعبیدہ نے حضرت خالد بن ولید کی کمان میں ایک فوج قنسرین روانہ کی۔ وہاں ہرقل کا نائب میناس موجود تھا، اس نے حضرت خالد بن ولید کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، لیکن اللہ کی تلوار سیدنا خالد کے آگے اس کی کچھ نہ چلی۔ وہ قنسرین میں قلعہ بند ہو گیا، مسلمانوں کا محاصرہ کچھ دیر جاری رہا، انجام کار اہل قنسرین نے ہتھیار ڈال دیے۔ حضرت عمر اس فتح سے بہت خوش ہوئے، انھوں نے حضرت خالد کے اختیارات میں نمایاں اضافہ کر دیا۔

اب حضرت ابوعبیدہ حلب جا رہے تھے۔ ابھی وہاں پہنچے نہ تھے کہ اطلاع آئی کہ قنسرین والے معاہدۂ صلح توڑ کر آمادۂ بغاوت ہو گئے ہیں۔ انھوں نے فی الفور ایک فوجی دستہ واپس قنسرین روانہ کیا۔ اہل شہر پھر محصور ہوئے اور انجام کار بھاری تاوان دے کر چھوٹے۔ حضرت ابوعبیدہ حلب سے دور تھے کہ عیاض بن غنم کی سربراہی میں ان کے بھیجے ہوئے مقدمہ نے حلب شہر کا محاصرہ کر لیا۔ حلب کے باشندگان نے بھی اب تک کی شرائط فتح پر صلح کی اور شہر عیاض بن غنم کے سپرد کر دیا۔ صلح نامے پر حضرت ابوعبیدہ کے دستخط ثبت ہوئے۔

مطالعۂ مزید: البدایہ والنہایہ (ابن کثیر)، الفاروق عمر (محمد حسین ہیکل)، تاریخ اسلام (اکبر شاہ خاں نجیب آبادی)

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

طالب محسن

متفرق سوالات

[المورد میں خطوط اور ای میل کے ذریعے سے دینی موضوعات پر سوالات موصول ہوتے ہیں۔ جناب جاوید احمد غامدی کے تلامذہ ان سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔ یہاں ان میں سے منتخب سوال وجواب کو افادۂ عام کے لیے شائع کیا جارہا ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

میلاد کی مجالس

سوال: ہمارے ہاں میلاد کی مجالس بہت ہوتی ہیں، ان کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب: میلاد کی مجالس، اصلاً، حضور سے اظہار عقیدت کے لیے منعقد کی جاتی ہیں۔ اصولاً، ایسی مجالس کے انعقاد میں کوئی حرج نہیں، جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے محاسن، مناقب اور حالات زندگی بیان کیے جائیں، لیکن ہمارے ہاں ان کے ساتھ بے بنیاد تصورات وابستہ کر دیے گئے ہیں اور ان میں جو کچھ پڑھا اور سنا جاتا ہے، اس میں بھی بہت کچھ ناحق کی آمیزش ہے۔ اس پہلو کو پیش نظر رکھیں تو اس طرح کی مجالس میں شرکت درست قرار نہیں دی جا سکتی۔

یہ ایک اصولی بات تھی۔ اب آپ ایک دوسرے پہلو سے بھی اس مسئلے پر غور کریں۔ وہ پہلو یہ ہے کہ اصلاً، دین میں مطلوب کیا ہے، ایک مسلمان کس طرح کی شخصیت ہوتا ہے اور اس کے شب و روز کس چیز کی تگ و دو میں گزرتے ہیں؟ مختصراً، اس کا جواب یہ ہے کہ بندۂ مومن کے شب و روز اپنے پروردگار کو راضی کر لینے کی سعی سے عبارت ہوتے ہیں۔ وہ اصلاً اپنے پروردگار کا بندہ ہوتا اور جس امتحان میں اسے ڈالا گیا ہے، اس میں کامیابی اس کا مطمح نظر ہوتی ہے۔ اب دیکھیے، شب و روز میں پانچ نمازیں، سال میں تیس روزے، اپنے مال پر زکوٰۃ اور اگر استطاعت ہو تو بیت اللہ کا

حج، اس پر فرض ہیں۔ اپنے اہل وعیال کے لیے نان ونفقے کا انتظام اس کی ذمہ داری ہے۔ یہ ذمہ داری ادا کرتے ہوئے اس پر لازم ہے کہ بہرحال، رزق حلال ہی کمائے۔ اپنے ہمسایوں اور اعزہ واقارب کے دکھ سکھ میں شریک ہو۔ وہ ضرورت مند ہوں تو جس حد تک ممکن ہو، ان کی مدد کرے۔ پھر اپنے ماحول (یعنی گھر، محلّہ اور دفتر وغیرہ) میں حق کا علم بردار بن کر رہے، برائی ہوتے دیکھے، تو وعظ وتلقین کے ذریعے سے اور اگر اختیار رکھتا ہو، تو حکمت کے ساتھ، اختیار کو استعمال کر کے برائی کو دور کرنے کی کوشش کرے۔ دین اور دین کے کاموں کو اگر اس کے مال اور مساعی کی ضرورت پڑ گئی ہے تو اس میں اپنا حصہ ڈالے۔ نمازوں میں فرض تک محدود نہ رہے، بلکہ سنن کے اہتمام کی سعی کرے اور ہو سکے تو تہجد بھی پڑھے۔ خیرات میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی، اللہ کی راہ میں غربا اور مساکین پر خرچ کرے۔ حج بھی کرے اور عمرہ بھی۔ رمضان کے روزے بھی رکھے اور نفلی روزے بھی۔ دین سیکھنے کی جدوجہد کرے۔ قرآن کے معنی سیکھے اور اس کی روزانہ تلاوت کا اہتمام کرے۔ غرض یہ کہ اپنے پروردگار اور اپنے دین کے ساتھ وابستگی کا ہر تقاضا پورا کرے اور اپنے سے وابستہ انسانوں کے ساتھ معاملات میں اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کرے۔

یہ حقیقی معنوں میں بندۂ مومن ہے۔ یہ زندگی ہر شخص سے، اصلاً، مطلوب ہے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ زندگی اس طرح گزرے تو اس میں میلاد کی مجالس کیا ہوں گی۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

سود پر قرض

سوال: بنک سرکاری ملازمین کو پندرہ تنخواہوں کے برابر قرضہ دیتا ہے۔ جس پر وہ گیارہ فی صد سالانہ سود لیتا ہے۔ بعض علما اسے صریح حرام قرار دیتے ہیں۔ اس لیے اس سے اجتناب کا حکم دیتے ہیں۔ جبکہ بعض علما کے نزدیک اس سے بچنا چاہیے، لیکن انتہائی ناگزیر حالات ہوں تو اسے لیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک میرے محدود علم کا تعلق ہے، قرآن میں قرض خواہ کو سود کھانے سے منع کیا گیا ہے اور تنقید کا موضوع قرض خواہ ہے، جبکہ مقروض کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہا گیا۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اس پر اپنی رائے دیجیے۔ (محمد کامران مرزا)

جواب: آپ کی یہ بات درست ہے کہ قرآن مجید میں جس چیز کو جرم قرار دیا گیا ہے، وہ سود خوری ہے۔ آپ نے جس اختلاف کا ذکر کیا ہے، اس کا باعث قرآن مجید کی کوئی آیت نہیں ہے۔ سود دینے کو گناہ قرار دینے والوں کی بنا ے استدلال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد ہے۔ مسلم میں نقل ہوا ہے:

لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم اكل الربوا ومؤكله وكاتبه وشاهديه وقال: هم سواء. (رقم ۱۵۹۸)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے اور کھلانے والے اور اس کی دستاویز لکھنے والے اور اس دستاویز کے دونوں گواہوں پر لعنت کی اور فرمایا: یہ سب برابر ہیں۔''

اس روایت کے لفظ 'مؤکل' (کھلانے والے) کا اطلاق عام طور پر علما اس آدمی پر کرتے ہیں جو قرض پر سود ادا کرتا ہے۔ استاد محترم جناب جاوید احمد غامدی کی تحقیق یہ ہے کہ 'مؤکل' کا لفظ سودی کاروبار کے ایجنٹ کے لیے ہے۔ اس لفظ کا عام طور پر طے کردہ مفہوم ٹھیک نہیں ہے۔ چنانچہ ہمارے نزدیک، سود ادا کرنا ایک کوتاہی ضرور ہے، لیکن اسے حرام قرار دینا مناسب نہیں ہے۔

غیر مسلم کی نجات

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

سوال: سورۂ مائدہ کی آیت کا ترجمہ ''تم میں سے کوئی مسلمان ہو، یہودی ہو، صابی ہو، نصرانی ہو، جو کوئی بھی اللہ پر اور آخرت پر ایمان رکھے گا اور نیک اعمال کرے گا، اس کے لیے کوئی خوف اور رنج کا مقام نہیں۔'' میں نے ایک مولوی صاحب کی تقریر سنی۔ انھوں نے کہا: جو شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت پر ایمان نہیں رکھے گا، اس کا ٹھکانا دوزخ ہے، خواہ وہ کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو۔ ازراہ کرم اس کی وضاحت کر دیجیے۔ (محمد کامران مرزا)

جواب: آپ کے سوال کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ قرآن مجید کی ایک آیت کی مراد سے متعلق ہے اور دوسرا مولوی صاحب کی رائے پر مشتمل۔ جہاں تک آیت کریمہ کا تعلق ہے تو اس میں نجات اخروی کا اصل الاصول بیان کیا گیا ہے۔ ہماری ایمانیات کی اصل صرف یہ ہے کہ ہم اس کائنات کے خالق و مالک کے وجود اور اس کے حضور جواب دہی پر ایمان رکھتے ہوں۔ کتابوں، فرشتوں اور نبیوں پر ایمان اس ایمان کے ایک تقاضے کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ (ان تین چیزوں میں بھی اصل کی حیثیت انبیا کی ہے۔ کتابوں اور فرشتوں پر ایمان اس کے لواحق میں سے ہے) لیکن یہ تقاضا ایک ایسا تقاضا ہے جس کے پورا نہ کرنے کا نتیجہ جہنم کی صورت میں نکلتا ہے۔ چنانچہ ہمارے نزدیک اگر کسی شخص کو یہ واضح ہے کہ فلاں شخص خدا کا پیغمبر ہے تو اس کی نیکیاں اور خدا اور آخرت پر ایمان اکارت چلا

جائے گا، اگر وہ اس شخص کو خدا کا پیغمبر نہیں مانتا اور اس کے لائے ہوئے دین کو اختیار نہیں کر لیتا۔

اس وضاحت سے آپ یہ بات سمجھ گئے ہوں گے کہ مولوی صاحب کی بات ادھوری ہے۔ پوری بات یہ ہے کہ ہر وہ نیک غیر مسلم جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے پیغمبر ہونے کا یقین ہے، وہ اگر مسلمان نہیں ہوتا تو وہ ایک سنگین جرم کا ارتکاب کر رہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ بھی نکل سکتا ہے کہ اس کی ساری نیکیاں رد کر دی جائیں اور عذاب میں مبتلا کر دیا جائے۔

حضور کی پیروی کا دائرہ

سوال: کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر عمل کی پیروی کرنا مسلمانوں کے لیے لازم ہے؟ (غلام یاسین)

جواب: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں ہیں: ایک اپنے معاشرے کے ایک فرد کی حیثیت اور دوسرے آپ کی دینی حیثیت۔ فرد کی حیثیت سے آپ اپنے معاشرے میں رائج رہن سہن اختیار کرتے ہیں۔ اس معاملے میں ہمارے لیے لازم نہیں ہے کہ ہم انھی تمدنی صورتوں کو اختیار کریں۔ دوسری حیثیت میں آپ اللہ تعالیٰ کے ایک بندے کی حیثیت سے دین پر عمل کرتے ہیں۔ اس معاملے میں آپ کا عمل ہمارے لیے اسوہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ باقی رہی آپ کی اللہ کے رسول کی حیثیت تو اس میں آپ دین کی حیثیت سے جو کچھ بھی دیں، اسے بے کم و کاست ماننا اور عمل کرنا ضروری ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اکابر صحابہ اور جمع حدیث سے گریز

سوال: اکابر صحابہ نے احادیث کے نسخے کیوں جلائے اور کیوں ضائع کیے؟ (محمد عارف جان)

جواب: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حوالے سے اس نوعیت کا ایک واقعہ کتب تاریخ میں نقل ہوا ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پانچ سو روایات پر مشتمل ایک مجموعہ تیار کیا ہوا تھا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس رکھا ہوا تھا۔ ایک رات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دیکھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بہت

بے چین ہیں۔ انھوں نے سبب پوچھا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خاموش رہے۔ صبح ہوئی تو انھوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے وہ نسخہ منگوایا اور اسے جلا دیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کا سبب پوچھا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا:

خشيت ان اموت وهي عندي فيكون فيها احاديث عن رجل قد ائتمنته ولم يكن كما حدثني. فأكون قد نقلت ذاك فهذا لا يصح. (اسد الغابہ ۳/ ۲۲۴)

''مجھے اندیشہ ہوا کہ میں مر جاؤں اور یہ مجموعہ میرے ہاں موجود رہے۔ درآنحالیکہ اس میں ایسی روایات موجود ہیں جو میں نے تو اپنے اعتماد کے آدمی سے سنی ہیں، لیکن ممکن ہے کہ بات اس طرح نہ ہو جیسے اس نے مجھے بتائی ہے۔ جبکہ میں اسے نقل کرنے والا ہوں۔ یہ صورت معاملہ درست نہیں ہے۔''

اس جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی خصوصی حیثیت کی وجہ سے ایسا کیا ہے۔ غالباً انھوں نے سوچا ہوگا کہ میرے مرتب کردہ مجموعہ کی جو حیثیت بن جائے گی، وہ درست نہیں ہوگی۔ جب اخبار احاد کو قطعیت حاصل نہیں ہے تو کوئی ایسا عمل بھی موزوں نہیں ہوگا جو اسے قطعی یا قطعیت کے قریب کر دے۔

زکوٰۃ کا نصاب

سوال: زکوٰۃ کا نصاب کیا ہے؟ کسی نے اپنی بیوی کے لیے (صرف استعمال کی غرض سے) چار تولے سونا خریدا تھا اور اس کے پاس اس کے علاوہ کچھ مزید رقم بھی ہے۔ کیا اس پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہے؟

(محمد کامران مرزا)

جواب: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ کا جو نصاب مقرر کیا تھا، وہ آج کے حساب کے مطابق ۶۴۲ گرام چاندی ہے۔ آپ کے پاس نقدی اور زیورات کی شکل میں جو مال موجود ہے، وہ یقیناً نصاب سے زیادہ ہے۔ اس لیے آپ پر زکوٰۃ بنتی ہے۔ آپ کے لیے اگر یک مشت زکوٰۃ ادا کرنا ممکن نہ ہو تو آسانی کے لیے یہ کر سکتے ہیں کہ یہ زکوٰۃ ماہانہ اقساط کی شکل میں ادا کر دیں۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

انشورنس کا جواز

سوال: کیا انشورنس جائز ہے؟ (محمد کامران مرزا)

جواب: انشورنس کے نظام میں اصولاً کوئی غلطی نہیں ہے۔ یعنی یہ کہ کوئی ادارہ لوگوں سے پیسے لے کر ان کو اس وقت ادا کر دے جب پہلے سے طے کردہ ضرورت سامنے آ جائے۔ یہ ادارہ کوئی کاروبار کر کے اس سرمائے میں اضافہ کرے اور اس اضافے کی ایک شرح لوگوں کی رقوم میں شامل کرتا رہے، اس میں بھی کوئی مضایقہ نہیں ہے۔ البتہ، ہمارے ملک میں انشورنس کے ادارے ممکن ہے کہ سرمایہ کاری سودی طریقے پر کرتے ہوں۔ اس صورت میں بہتر یہ ہے کہ اس طرح کے ادارے سے انشورنس کرانے سے اجتناب کیا جائے۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

فجر کی قضا نماز

سوال: فجر کی نماز طلوع آفتاب کے بعد اور زوال سے پہلے ادا کی جائے تو مکمل ادا کرنی پڑتی ہے۔ کیا یہ قضا ہوتی ہے؟ (محمد کامران مرزا)

جواب: اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی کی آنکھ ہی اس وقت کھلی ہے جب سورج طلوع ہو چکا ہے۔ اس صورت میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے یہی امید ہے کہ یہ نماز ''ادا نماز'' قرار پائے گی۔ دوسری یہ کہ نماز سستی اور غفلت کی وجہ سے رہ گئی۔ اس صورت میں یہ نماز قضا ہو گی۔ مکمل نماز سے غالباً آپ کی مراد دو سنت اور دو فرض یعنی چار رکعت پڑھنا ہے۔ دو سنت اصل میں نفل نماز ہے اور احناف اسے سنت اس لیے کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مداومت کے ساتھ پڑھے ہیں۔ بہر حال ان کا پڑھنا دونوں صورتوں میں لازم نہیں ہے۔ لیکن ان کی ادائی کا اجر بہت زیادہ ہے۔ اس لیے دونوں صورتوں ہی میں اسے پڑھنا افضل ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ بھی یہی ہے۔

ماضی کی قضا نمازیں

سوال: میں گزشتہ چار سال سے پانچ وقت کا نمازی ہوں۔ اس سے پہلے غافل تھا۔ ہزاروں نمازیں

قضا ہوں گی۔ کیا ان کو پڑھنا ضروری ہے؟ (محمد کامران مرزا)

جواب: اس معاملے میں اہل علم کی دو آرا ہیں۔ ایک یہ کہ یہ قضا نمازیں ادا کرنی چاہییں۔ دوسری یہ کہ اس کوتاہی پر خدا سے توبہ کرنی چاہیے۔ آیندہ نمازوں میں پابندی میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیے اور اگر کوئی کوتاہی ہو جائے تو اس کا فوراً ازالہ کرنا چاہیے۔ ہمارے نزدیک بہتر یہی ہے کہ ایک اندازہ قائم کر کے قضا نمازیں پڑھ لینی چاہییں۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا مشورہ یہ ہے کہ سنن کی جگہ اگر یہ نمازیں پڑھ لی جائیں تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ دونوں کا اجر ادا کر دیں گے۔

حدیث اور قرآن میں تضاد

سوال: اگر کوئی حدیث قرآن کے مضمون سے ٹکرا رہی ہو تو کیا کرنا چاہیے؟ (غلام یاسین)

جواب: حدیث اور قرآن میں تضاد کی بیش تر مثالیں بالعموم قرآن کی روشنی میں حدیث کو حل نہ کرنے سے پیدا ہوئی ہیں۔ مزید براں کلام فہمی کے جو اصول بعض فقہا کے پیش نظر رہے ہیں وہ بھی اس کا باعث بنے ہیں کہ بعض چیزوں کو متضاد یا مختلف قرار دے دیا جائے۔ ہمارے خیال میں صحیح روایت اور قرآن مجید میں تضاد ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ البتہ بطور اصول یہی بات کہی جائے گی کہ جو حدیث قرآن سے ٹکرا رہی ہو، وہ قبول نہیں کی جا سکتی۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

کیا یہ حرابہ تھا؟

سوال: ایک مشہور روایت ہے کہ ایک خاتون آپ کے پاس آئی اور اس نے زنا کا اعتراف کیا۔ آپ نے فرمایا کہ وضع حمل کے بعد آنا... بعد ازاں آپ نے اس کو سنگ سار کرایا۔ اس خاتون کو سنگ سار کیوں کیا گیا۔ اس کو سو کوڑے کیوں نہ لگائے گئے۔ کیا وہ حرابہ کی مرتکب ہوئی تھی۔ (محمد عارف جان)

جواب: یہ سوال ایک اصولی حقیقت کو نظر انداز کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ میں اپنی بات کو مثال سے واضح کرتا ہوں۔ اخبارات میں آئے دن مقدمات کی خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ ان خبروں سے قانونی ضوابط کو متعین کیا جا سکتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدمات کے فیصلوں سے متعلق روایات واقعات کا

محض جزوی بیان ہیں۔ راوی نے معلوم نہیں واقعے کے کن اہم پہلوؤں کو درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ زنا کی سزا قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے۔ اسی طرح حرابہ کی سزا بھی قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے۔ ہم ذرہ برابر شبے کے بغیر یہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قانون اور انصاف کے سب تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر مجرموں کو سزائیں دی ہیں۔ جس مجرم کو حرابہ کی سزا دی گئی ہے، وہ یقیناً اسی سزا کا مستحق تھا۔ کسی راوی کے بیان سے یہ حقیقت بدل نہیں سکتی۔

اصولی بات یہ ہے کہ واقعات سے قانون اخذ کرنا درست نہیں۔ قانون کی روشنی میں واقعات کو سمجھا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کا اپنی مخلوق پر درود

سوال: قرآن مجید میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اور فرشتے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر رحمت بھیجتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تو خالق ہیں اور بے نیاز ہیں۔ ایک نبی پر یعنی اپنی ہی ایک مخلوق پر رحمت بھیجنے سے کیا مراد ہے؟ (محمد عارف جان)

جواب: عربی زبان میں بالخصوص اور عام زبانوں میں بھی فعل کی فاعل سے نسبت اس کے معنی میں تغیر کر دیتی ہے۔ اس کی اردو میں مثال محبت ہے۔ ماں بیٹے کی محبت اور میاں بیوی کی محبت دو مختلف چیزیں ہے، لیکن ایک اشتراک کے باعث لفظ ایک ہی بولا جاتا ہے۔ 'صلی' کا لفظ جب بندوں کی نسبت سے بولا جاتا ہے تو اس سے رحمت کی دعا کرنا مقصود ہوتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ کی نسبت سے بولا جاتا ہے تو اس میں رحمت کرنے کے معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔ بے شک، اللہ تعالیٰ خالق اور بے نیاز ہیں، لیکن وہی سب کا سہارا اور ملجا و ماویٰ بھی ہیں۔ لہٰذا ان کی عنایات ہی سے یہ کاروبارِ زیست رواں دواں ہیں۔ سورۂ اخلاص میں یہ دونوں پہلو یکجا بیان ہو گئے ہیں۔ 'ھو اللّٰہ احد'' 'وہ یکتا ہے'' یعنی ہر شے سے غنی ہے۔ 'اللّٰہ الصمد'' 'اللہ سب کا سہارا ہے۔'' یعنی سب مخلوق اس کی محتاج ہے اور وہ سب کا حاجت روا ہے۔

غیر مسلم کو زکوٰۃ

سوال: کیا غیر مسلموں کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے؟ (محمد عارف جان)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

جواب: اس معاملے میں اختلاف ہے۔ ہمارے خیال میں قرآن وسنت میں کوئی قطعی چیز نہیں ہے جو اس میں مانع ہو۔ یہ اجتہادی معاملہ ہے۔ ہمارا رجحان یہی ہے کہ غیر مسلم کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے۔

خوش عقیدگی اور بدعت

سوال: جو لوگ خوش عقیدگی کی وجہ سے بدعات کا شکار ہیں ان کا انجام کیا ہوگا؟ (محمد عارف جان)

جواب: ہر مسلمان اس بات کا مکلّف ہے کہ وہ صرف اسی بات کو دین سمجھے اور اسی کو دین کی حیثیت سے اختیار کرے جس کے بارے میں اس کی رائے یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بتائی ہے۔ اس سے فرق نہیں پڑتا کہ اس کی یہ رائے براہ راست مطالعے سے بنی ہے یا اس نے یہ بات کسی عالم دین سے جانی ہے۔ یہ رائے اگر غلط بھی ہو تو امید ہے، اجر ملے گا۔ بشرطیکہ یہ آدمی اپنی غلطی واضح ہونے کی صورت میں اپنی رائے اور اپنے عمل کو تبدیل کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار ہے اور اسے صرف صحیح دین پر عمل کرنے پر اصرار ہے۔ دین میں گمان اور تمنا پر عمل خطرناک راستہ ہے۔ دین کے ساتھ خلوص بنیادی شرط ہے، اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ کئی غلطیاں نظر انداز کر دی جائیں گی۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

بدلہ لینا

سوال: حکومت کے کارپرداز اگر مجرموں کے ساتھ ملے ہوئے ہوں تو کیا مجرموں سے خود بدلہ لیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ (محمد عارف جان)

جواب: ایک ملک جہاں مجرموں سے نمٹنے کا نظام قائم ہو، وہاں خود بدلہ لینا انارکی پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے۔ اس لیے اسے درست قرار نہیں دیا جا سکتا۔ آپ نے جو صورت بیان کی ہے وہ ہمارے جیسے معاشروں میں عام ہے۔ یہ اس بات کا عذر نہیں بننی چاہیے کہ ہم خود ہی کسی کو مجرم ٹھہرائیں اور خود ہی اسے سزا دے ڈالیں۔ بہتر یہی ہے کہ معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا جائے۔ اس کے لیے کوئی مشکل نہیں کہ وہ حالات کو بدل دے اور مجرم اپنے کیفر کردار کو پہنچ

جائیں۔ اگر اس کی مصلحت یہی تھی کہ اس دنیا میں ایسا نہ ہو تو آخرت میں مجرم بھی اپنے انجام کو پہنچے گا اور مظلوم بھی وہ کچھ پالے گا جس کے بعد کوئی شکایت باقی نہ رہے گی۔

لونڈیوں کا نظام

سوال: لونڈیوں اور کنیزوں کا نظام کب تک رہا؟ جس طرح شراب کو واضح طور پر حرام قرار دے دیا گیا، لونڈیوں کو کیوں ختم نہ کیا گیا۔ اگر لونڈی کا نظام صرف سو سال پہلے ختم ہوا ہے تو آخر آج ایک لونڈی کیوں نہیں رکھی جا سکتی۔ (محمد عارف جان)

جواب: قرآن مجید نے لونڈیوں اور غلاموں کے نظام کو واضح مصالح کے پیش نظر یک قلم ختم نہیں کیا۔ ایسے معاشرے جہاں غلام ہزاروں کی تعداد میں موجود ہوں اور ہر گھر میں ان کے معاشی سیٹ اپ کا حصے بنے ہوئے ہوں۔ غلامی کو یک قلم ختم کرنا انسانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو بے سہارا اور بے گھر کر دینے کے مترادف تھا۔ اللہ تعالیٰ نے جنگوں میں گرفتار ہونے والوں کو غلام بنانے کا آپشن ختم کر دیا اور یہ کہا کہ انھیں فدیہ لے کر یا احسان کر کے چھوڑ دیا جائے۔ موجود غلاموں کو مکاتبت کی اجازت دے کر ان کے لیے آزادی حاصل کرنے کی راہ پیدا کر دی۔ خلافت راشدہ میں انھی دونوں ضوابط پر پوری طرح عمل کیا گیا۔ مشکل یہ پیش آئی کہ اسلام سے باہر کی سوسائٹی میں غلام بنانے کا عمل جاری رہا اور مکاتبت کی راہ سے فائدہ اٹھانے کا عمل بھی بہت محدود پیمانے پر ہوا چنانچہ آیندہ کئی صدیوں تک غلامی کا رواج قائم رہا۔ غلام بنانا ایک کریہہ عمل ہے، یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے جائز رکھتے۔ سورۂ محمد (۴۷:۴) کی محولہ آیت نے واضح طور پر غلام بنانے سے روک دیا ہے۔ جاری غلامی کو ختم کرنے کی جو کوشش امویوں اور عباسیوں کو کرنی چاہیے تھی، وہ انھوں نے نہیں کی اور اس کا اعزاز امریکیوں کو حاصل ہوا کہ انھوں نے اس مکروہ کاروبار کو بالکلیہ ختم کر دیا۔ کسی کو غلام بنانا ایک ناپسندیدہ فعل ہے، اس کی اجازت کیسے دی جا سکتی ہے۔

---

www.javedahmadghamidi.com